ظاہر ہوتا ہے کہ غیروں کا لباس اوسپر ٹھیک نہیں آیا۔ کوئی بات ایسی نہیں لکھتا جس سے
اوسکا مذہب یا قوم دریافت ہو سکے۔ ہندو اوسکے نزدیک کافر ہوتا ہے اور مسلمان دین حق کا
پیرو۔ پیروں اور ولیوں کی نسبت اس طرح کی خوشامد لکھتا ہے کہ جس سے وہ بڑا کٹا پکا ہم
مسلمان معلوم ہو۔ ہندو کے مرنے پر وہ فی النار والسقر لکھتا ہے اور مسلمان کی وفات
اوسکو جام شہادت پلاتا ہے۔ اپنے فاتحین کی زبان کے رنگین فقرے کے فقرے
اور عبارتیں کی عبارتیں اوسکو ازبر ہوتی ہیں وہ لکھتا ہے کہ اسلام کی روشنی دنیا پر
اپنا نور پھیلا رہی ہے۔ محرم الحرام کو پاک اور قرآن کو صحیفہ نورانی لکھتا ہے۔ اپنی
تصنیف کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرتا ہے۔ اوسکے بعد حمد الٰہی اور نعت رسول
اور منقبت آل رسول تحریر کرتا ہے۔ اور پھر مسلمانوں کے مذہب کے عقائد دراصل دیکھتا ہے
ایک ہندو مصنف جسکا اس کتاب میں بیان ہے لکھتا ہے کہ وہ اپنی ضعیفی میں جنازہ کے
سرہانے اور قبر کے کنارہ پر کھڑا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہوگا کہ بہت دن نہ گذرنے پائینگے
کہ جنازہ کی جگہ ارتھی اور لب گور کی جگہ لب گنگ ہوگا جہاں جلا کر اوسکی خاکستر کو دریا میں
پھینک دینگے۔ اسکے بعد کے زمانہ میں بھی جب خوشامد کی ضرورت نہ رہی تھی ان غلاموں
کے غول میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملتا جو اپنے ملک کی تاریخ کو دل لگا کے لکھتا اور
اپنے ان فیلنگز جذبات اور مسرتوں کو ہمارے سامنے پیش کرتا جو ایک مدت کی مظلوم
قوم اپنے پہلے آقاؤں کے ظلم سے نجات پاکر ظاہر کر سکتی ہے۔ ان غلاموں میں
ایک بھی ایسا نہیں جو دل کی قدرتی زبان سے بغیر قید اور چاپلوسی کے ان باتوں کو اظہار کرتا
گو ان تصانیف کی اصلی قیمت بہت کم ہو تو بھی اونسے وہ باتیں دریافت ہوتی ہیں
جو ایسے شخص کے لئے قابل غور ہیں جو تعجب کی نگاہ سے اونکا امتحان کرتا ہے۔ ان سے
جہالت کی تاریکیاں دور ہو جائینگی جو ہندوستان کے علم پر چھائی ہوئی ہیں اور ثابت ہوگا
کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کی احتیاج کہ وہ لکھی جائے ہنوز باقی ہے۔ ان تاریخوں سے
ہماری ہندوستانی رعایا پر وہ فوائد زیادہ منکشف ہونگے جو ہماری سلطنت کی عدالت اور

ترقی نے پیدا کی ہیں اگر ان سے انہوں نے ہدایت پائی تو ان بیباک باتوں سے ہمکو نجات ملیگی جو ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کی نسبت وہ لوگ اکثر کہتے ہیں جو اکطرح پر جاہل نہیں ہیں - وہ بڑے لوگ جو اس وقت اپنے کارناموں کی نشان و شوکت میں شہرہ آفاق ہیں جنکو بعض مسلسل فتوحات میں ناموری حاصل ہے جب اونکے حالات پر سے خوشامد کا پردہ اٹھا دیا جائیگا اور بلاغت کا لباس اوتار کر اونکو برہنہ کر دیا جائے گا تو وہ سچی صورت میں ظاہر ہونگے اور اونچے کر کے دکھلائے جاینگے تو غالبًا دنیا اونپر لعنت بھیجیگی بہر ان یا وہ گروہ کے منہ سے جو ہماری گورنمنٹ میں بڑے سے بڑے درجہ کی آزادی اور اونسے بہت زیادہ پولیٹکل اختیارات رکھتے ہیں جو کبھی پہلے کسی محکوم قوم کو دئے گئے ہوں قومی ہمدردی اس موجودہ زمانہ کی خراب حالت کی نسبت لغو بیانیاں نہ سنی جاینگی - اگر یہ بابو ان تاریخوں میں سے ایک جملہ بھی دیکھ لینگے - جو یہاں بیان ہوئی ہیں تو ان قومی ہمدردوں اور حامیوں اور مربیوں کو معلوم ہو جائیگا کہ اوس تاریک زمانہ میں جسکے لئے وہ آہیں بھر رہے ہیں اگر اونکے خیالات کا ایک ذرہ بھی زبان سے نکلتا تو بجائے سکوت اور تحقیر کے جلتے سیسہ اور سولی کی سزا سے اونکے ساتھ سلوک کیا جاتا فقط

جو تال بوئس ویلر صاحب جنہوں نے ہندوستان کی تاریخوں کے لکھنے میں بڑی تحقیق و تدقیق کی وہ اپنی من موجی رائیں مسلمانوں کی تاریخوں کی نسبت لکھتے ہیں +

مسلمانوں کے عہد میں مورخوں نے جو واقعی تاریخیں لکھی ہیں اونمیں زیادہ تر راستی اور درستی اور سچائی پائی جاتی ہے بعض وقت وہ ان بدکار بادشاہوں کی بھی تعریف کرتے ہیں جنکے مسلمان بھی بیسواء اسکے یہ مورخ معتقد و متدین بھی تھے علماء اونکو اپنی حد سے بڑے نکلنے نہیں دیتے تھے - دار السلطنت میں علما فضلا مفتیوں فقیہوں و قاضیوں کا ایک مجمع رہتا تھا شریعت اسلام سلطنت کو چلاتا انکا کام تھا ایشیا کی شخصی سلطنت میں یہی گروہ تھا جو اپنی آزادانہ آواز نکال سکتا تھا - اگر مسلمانوں کی عہد سلطنت کے مورخ راستی کی بجائے چاپلوسی اور خوشامد کرتے تھے تو یہ گروہ اونکی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو جاتا تھا

بیتے وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہوجاتے ہیں پھر ہندوستان میں پبلک اوپی میں یعنے عام راے معدوم ہوگئی خوشامد و دروغ کا نام تاریخ ہوگیا۔ سب بڑھ کر ابوالفضل اور خافی خان جیسے خوشامدی مورخ پیدا ہوگئے ۔

اہل یورپ خاص کر ہندوستان کی عہد سلطنت اسلامیہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں ۲

دنیا میں ہر چیز دو نگاہوں سے دیکھنے والے دیکھتے ہیں ایک کری ٹکل آئی یعنے نکتہ چینی اور عیب بینی کی نگاہ سے دوم فیورابل آئی سے یعنے مشفقانہ نگاہ سے انسان کو اپنا نفس لیا عزیز ہے کہ جو باتین اوسکی اپنے نفس سے متعلق ہوتی ہیں اوسکو مشفقانہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور غیر و نکی باتون کو بدبینی کی نگاہ سے۔ ایک ہی چیز دونو نگاہوں کے دیکھنے سے بد و نیک نظر آتی ہیں۔ کری ٹکل آئی سے دیکھنا نہایت فائدہ مند اور نیک کام ہے۔ ایک بڑے بزرگ مسلمان کا قول ہے کہ علم میں اول قدم شبہ ہے یعنے کری ٹی سزم مگر اسطرح دیکھنے کی شرائط ایسی سخت ہیں کہ وہ شاذ و نادر ہی کسی میں پائی جاتی ہیں جب انسان کا نفس تعدیل کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خبر کو تحقیق کر کے سچ کو جھوٹ سے جدا کر سکتا ہے مگر خود رائی تعصب بے ہی رقابت خود پسندی خود نمائی کے اثر نفس میں تعدیل نہیں پیدا ہونے دیتے۔ یورپ میں مورخوں کا دائرہ فراخ ہے جس تحقیق و تدقیق سے وہ تاریخون کو لکھتے ہیں اوسکو میں آگے بیان کرونگا۔ اونہوں نے اس علم کو معراج پر پہنچا دیا۔ تاریخ میں وہ دقایق علمیہ داخل کیے ہیں جنکا دنیا میں پہلے سان گمان بھی نہ تھا۔ ان مورخوں میں متعصب۔ نیک نہاد۔ پاک دل۔ ظاہر شناس۔ دقیق النظر درست عزیمت و نیک نیت ہوتے ہیں اور اونکے درجے متفاوت اعلی متوسط ادنی ہوتے ہیں مگر بعض اسباب ایسے جمع ہوگئے ہیں سارے طائفے ہندوستان میں مسلمانوں کی عملداری کے باب میں یہ ایک ہی سما باندھتے ہیں گویا اسمیں خیر اتفاقی اور شر دامی و معمولی تھا۔ اور اس کو وہ اپنی بڑی راست بیانی جانتے ہیں

فرنگستانی مورخون کا استناد مسلمانوں کی سلطنت ہند کا +

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا انگریزی مورخ مسلمانوں کی تاریخوں اور مورخوں کو بے وقعت گنتے ہیں وہ سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا استناد و ثبوت ان نوشتوں سے کرتے ہیں جو فرنگستان کی مختلف قوموں کے سیاحوں نے یہاں آنکر یہاں کے حالات میں لکھے ہیں ان کے بیانوں میں ایسی مطابقت و موافقت وہ دیکھتے ہیں کہ انہیں جھوٹ کا احتمال کس طرح نہیں کرتے

ان سیاحوں کی تفصیل یہ ہے (۱) ولیم ہاکنس ہے جو ایک انگریزی بحری کپتان تہا وہ آگرہ میں دو تین برس ۱۶۰۸؁ سے ۱۶۱۱؁ تک رہا وہ جہانگیر کے عہد میں آیا تھا۔ اگرچہ وہ کوئی بڑا لیاقت مند انگریز نہیں تہا مگر اوسنے لےونٹ میں ترکی زبان سیکہی تھی۔ اسلئے وہ جہانگیر سے جو اپنی جغتائی زبان بول سکتا تہا ہمکلام ہوتا تہا اسلئے وہ بادشاہ کو عزیز تہا (۲) سر طامس رو وہ ایک عالی خاندان انگریز تھا۔ اس زمانہ کے انگلستان کے مدبروں میں شمار ہوتا تھا جیمس اول نے اوسکو نائٹ کا خطاب دیا اور اپنا ایلچی بناکے جہانگیر کے پاس بہیجا وہ ۱۶۱۶؁ سے ۱۶۱۸؁ تک یہاں ہندوستان میں رہا اس کا سفر نامہ لکہا ہوا ہے۔ جس سے بہت سے حالات انگریزی تاریخوں میں بڑے اعتبار سے نقل کیے جاتے ہیں (۳) سر طامس ہربرٹ ایک اشراف انگریز تہا جسنے ۱۶۲۶؁ سے ۱۶۲۸؁ کے قریب ہندوستان میں سیاحت کی (۴) جان البرٹ دی مینڈیلس لو ایک نوجوان اشراف تہا جسنے ڈیوک ہولسٹین کے دربار میں ترتیب پائی تھی۔ اوسنے ہندوستان میں ۱۶۳۸؁ و ۱۶۳۹؁ میں سیاحت کی (۵) فرینکوا سر برنیر ایک فرانسیسی طبیب تہا جو ہندوستان میں ۱۶۵۶؁ سے ۱۶۶۸؁ تک سکونت پذیر ہوا۔ وہ دہلی میں بادشاہ کے دربار میں رہتا تہا۔ اور ہندوستان میں کشمیر سے گل کنڈہ تک سیر کی اسکا سفر نامہ انگریزی اور اردو دونو میں چھپا ہے (۶) جان بپٹسٹ ٹیورنیر اورنگ زیب اور شاہجہاں کے ایام سلطنت میں دو تین دفعہ ہندوستان میں آیا وہ ایک ہوشیار جوہری تہا (۷) موسیو تہیونو دی نوٹ اوسنے اورنگ زیب کی ابتداء سلطنت میں ہندوستان میں سفر کیا وہ ایک فرانسیسی اشراف تہا (۸) منوچی یہ ایک وینیشیا کا طبیب تھا ۱۶۴۹؁ کے قریب ہندوستان میں آیا اور یہاں ۴۸ برس کے قریب رہا جب یورپ میں اوسنے مراجعت کی تو وہ اپنے ساتھ ایک کتاب پرتگیزی زبان میں اپنی تصنیف کی ہوئی لایا جس میں مغل سلطنت کے حالات مع اپنے مشاہدات کے کچھ فارسی کتابوں سے ترجمہ کرکے لکھے تہے اور اس کتاب کو اسنے ہندوستان کے سلاطین اور امراء کی تصاویر سے آرایش دی تھی بادشاہی مصوروں کو بہت اجرت دیکر رنگین کرایا تہا۔ یہ کتاب معلوم نہیں کس طرح مسٹر فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی ملازم کے ہاتھ آئی اوسنے فادر کیٹرو ایک جیسوٹ پرلیسٹ کو دکھائی اوسنے اپنے کیتھولک مذہب کی سعی و کوشش میں

کامیابی دیکھ کر اپنے مطلب کا سمجھ کر اوسکو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا اور اسمیں اپنی طرف سے
دخل در معقولات دیا اور اسکا ترجمہ انگریزی میں ۱۸۲۶ء میں ہوا اور لندن میں چھپا شاہجہاں کی سلطنت
کے بیان کے کوئی اور تاریخ اس سے زیادہ معتمد اور مستند نہیں سمجھی جاتی غرض اہل یورپ کا خیال
یہ ہے کہ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کی تاریخ کی تصویر انہیں فرنگیوں کی تحریر میں صحیح صحیح کھچی
ہوئی ہے اور باقی خیر ہے۔ سفرنامہ بھی اگرچہ تاریخی سلسلہ کا ایک دلچسپ حصہ ہوتا ہے لیکن
جتنا دلچسپ ہے اوتنا ہی غلطیوں کے احتمالات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس تہذیب اور شائستگی
کے زمانہ میں جو ہندوستان میں یورپ کے خاص کر انگلستان کے سیاح آتے ہیں
ریلوں میں سفر کر کے اور اپنے دوست انگریزوں کے گھر اتر کر اور ہندوستانیوں سے ملکر
یہاں کے حالات کے مسودے کو پٹ منٹوں میں لکھ کر انگلستان لے جاتے ہیں اور وہاں جاکر اونکو
جو اخباروں اور رسالوں میں چھپواتے ہیں تو وہ اکثر باتیں یہاں کے اینگلو انڈین کے
خلاف رائے شائع کرتے ہیں تو اونپر انگریزی اخبارات اعتراضات کی بوچھاڑ مارتے ہیں اور
اونکی غلطیاں بتلاتے ہیں اور اونکو کم علم کہہ دیتے ہیں سفرنامہ لکھنے والوں کو بڑی غلطی
جزئیات سے کلیات قائم کرنے میں پڑتی ہے سفر میں انسان کو جن اشخاص سے سابقہ
پڑتا ہے وہ اونکے اخلاق۔ عادات۔ خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم
کر لیتا ہے حالانکہ ممکن ہے کہ وہ امور انھیں چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں مثلاً ایک ممبر
پارلیمنٹ کا انگلنڈ سے ہند میں آیا اور اوسکی کانگریس کے کسی لائق ممبر سے ملاقات ہوئی
تو وہ برٹش گورنمنٹ کے عیوب کچھ اوسکے ذہن نشین کر دیگا پس یہ اس ایک ممبر کی رائے
سنکر یہ قاعدہ کلیہ بنائیگا کہ سارے ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کی نسبت یہی رائے رکھتی
ہے۔ انسان بالطبع عام نتیجہ نکالنے کا شوق رکھتا ہے مگر یہ صبر اوسکو کہاں کہ بہت سے جزئیات
کو دیکھ کر استقرار سے قاعدہ کلیہ بنائے غرض نہ وہ واقعہ کے اسباب کی جستجو کرتا ہے
نہ اسمیں اپنا وقت صرف کرتا ہے نہ اوسکو اس سفر میں اسقدر فرصت مل سکتی ہے
ایک اور بڑا سبب غلطی کا یہ بھی ہوتا ہے کہ جب مسافر کسی ملک کا سفر کرتا ہے اوسکی نسبت

پہلے سے خیالات مخالف یا موافق ذہن میں جمے ہوئے ہوتے ہیں پس جو باتیں اوسکے
خیالات کے موافق ہوتی ہیں اُنکو جلد قبول کر لیتا ہے اور اوسکو اجمالی کیفیت ایسی نہیں
حاصل ہوتی کہ وہ استنباط و نتائج کے لئے کافی ہو۔ وہ بے صبری سے نتائج کو قائم کرتا ہے اور ہر واقعہ
کے ساتھ قیاسات قائم کرتا ہے۔ اور جو اوسکے دل میں بری پرورش یعنی دل میں جو حسن ظن
یا سوء ظن موجود ہوتا ہے وہ اپنا اثر اوسکے دل میں چپکے چپکے کرتا ہے کہ اوسکو خبر نہیں ہوتی
دل میں جو پہلے سے حسن ظن یا سوء ظن ہوتا ہے اوسکے کئی سبب ہوتے ہیں اول تعصب
مذہبی ہے۔ خواہ آدمی کیسا ہی وسیع المشرب و فیاض دل ہو لیکن بچپن سے جس قسم کے
خیالات میں پرورش پائی ہے اور جو خیالات ابتدا ہی سے اوسکو گھیرے ہوئے ہیں اور اوسکی
تعلیم نے جو مخزن معلومات اوسکے ذہن میں جمع کیا ہے۔ کانوں میں ہر طرف سے جو آوازیں اوسکے
کان میں آتی ہیں اور بہت سی اور چیزیں ہیں سب کا مقابلہ تعصبی تنہا نہیں کر سکتی گو اسوقت
یورپ میں تعصب مذہبی ضعیف ہو گیا ہے اور یہ طریقہ مردود سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف
خیالات مذہبی رنگ کے تعصب میں صاف صاف دکھلائے جائیں مگر اب ایک دانشمندانہ طریقہ
اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں و اسلامی قوموں۔ اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی
پیرایہ میں ظاہر کئے جاتے ہیں اور علم ادب کی تصنیفات میں اونکو ایسا جذب کر دیا ہے کہ
تحلیل کیمیاوی بھی اونکو جدا نہیں کر سکتی۔ اگرچہ یہ طریقہ کل اسلامی سلطنتوں کے ساتھ
برتا جاتا ہے مگر خاص کر زیادہ تر مسلمانوں کی ہندوستان کی سلطنت کے ساتھ جس میں بہت سے
اغراض بھی شامل ہوتے۔ وہ مسلمانوں کے نیک کاموں کو بھی ایسے پیرایہ سے بیان
کرتے ہیں جو وہ خود غرضی پر محمول ہوتے ہیں اہل یورپ نے جیسا کہ اور علوم میں کمال
پہنچایا ہے مصوری میں بھی کمال حاصل کیا ہے کہ وہ اور قوموں کی تاریخ کے اپنے سواء
ایسی یک رخی تصویر کھینچنے میں قلم کا زور دکھاتے ہیں جس میں کوئی حسن نظر نہ آئے۔ اپنی سلطنت
کی خوبیوں کے بتلانے کے لئے یہ ایک لازمی امر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کے
عیب چھانٹے جائیں۔ اس اپنے بیان کی توضیح کے لئے میں چند صفحے سر جان الیٹ کے

دیباچہ کا ترجمہ کرتا ہون - اگر ہمارے زمانہ کا کوئی بڑا حاکم یہ خواہش رکہتا ہے کہ شاہان مغلیہ
کی عالی شان عمارتون کا حال بیان کرے تو وہ اپنے کام تئین افسردہ خاطر ہو جائیگا جب وہ
دیکھے گا کہ سوا محلات و مساجد و مقبرون کے کوئی چیز ایسی نہین جسکی تحسین سرائی ہو سکے اوسکو
معلوم ہوگا کہ اگر شہنشاہان دہلی کی فہرست میں سے تین نام نکال دئے جائیں تو ایک بادشاہ
بھی ایسا نہ ہوگا جسنے اپنی رعایا کی خوشی و آرام کی فکر کبھی کی ہو سواے چند سرایون اور پلون
کے جو صرف ایسی سڑکون پر تھے جہان سے شاہی لشکرون کا گذر ہوتا تھا کوئی اونکے نشان
سے ایسی نہ پائیگا جسمیں خود غرضی کے اصول نہ شامل ہون - شاہان مغلیہ کی بہت سی تعمیرات
کی حمایت و زیبائش سے انکار نہیں لیکن ذاتی عظمت نمائی اور خود بینی اونکی تعمیر کا سبب ہوئی
اور سوا ان چند عمارات کے جو اوپر بیان ہوئین کوئی تعمیر ایسی نہین کہ جو رفاہ عام کا کام دیتی
ہو سوا اس حاکم کے دل میں لالہ رخ کی فرضی حکایت سے شاعرانہ خیالات پیدا ہوے ہون اور ذہن
مین جہانگیر کی شاہ راہ کی تصویر پیش نظر آئی ہو جو ایک دار الخلافہ سے دوسری دار الخلافہ تک
جاتی تھی اور جسپر ابتدا سے انتہا تک شاندار درختون کا سایہ تھا اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر
سراے اور تالاب تھے - لیکن شاہ جہانگیر کی فیاضی کا درجہ اوسکی نظرون میں کم ہو جائے گا جب
دریافت ہوگا کہ شیر شاہ نے جہانگیر سے پہلے ایسا ہی کیا تھا اور شیر شاہ سے پہلے کسی اور بادشاہ
نے بھی ایسا شاہ راہ بنایا تھا اور یہ خیال بھی خلاف عقل نہ ہوگا کہ اس بڑے شاہ راہ کا اب کوئی
نشان سوائے اسکے کہ کہیں کوئی فرسنگ کا منارہ ٹوٹا پہوٹا کھڑا ہوا باقی نہیں اور اس سرسبز
سر درختی کو جو فی الحقیقت کوئی بڑا کام نہ تھا تین بڑے بادشاہوں کی دولت اور قدرت بھی
اس قابل نہ ہوئی کہ اوسکو دائمی یادگار بنا سکتی جب یہ شخص پڑہتا ہے کہ فیروز شاہ و علی مردان خان
کی نہرون نے ملک کو قطع کر رکھا تھا تو اوسکے ساتھ ہی اوسکو دریافت ہوگا کہ اگر یہ نہرین
کبھی جاری بھی ہوئیں تو صرف شاہی محلون اور شکارگاہون میں آب رسانی کے لئے ہوئیں
تھیں اور جب یہ نقل کرے گا کہ تیمور کے مورخون میں سے کسی نے بھی ان نہرون کا ذکر
نہیں کیا جو مقامی حالات کو ہمیشہ مفصل لکھا کرتے تھے اور یہ کہ بابر بادشاہ نے اپنی تزک میں

لکھا ہے کہ ہندوستان کے صوبوں میں کوئی نہر نہیں ہے۔ حالانکہ ان دو نو فاتحین کو اگر ان نہروں میں پانی ہوگا تو عہد کرنا پڑا ہوگا تو ایسی صورت میں اوسکو شبہ ہوگا کہ آیا یہ نہریں کبھی جاری بھی ہوئی تھیں یا فقط کھود کر چھوڑ دی گئی تھیں علی مردان خان کی تعریف اس امر کی بابت سے کہ نہر بنائی وہ اور بھی کم ہونی چاہئے کیونکہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ علی مردان خان کی نہریں عوام الناس کے فائدہ کے لئے تعمیر نہیں ہوئیں بلکہ اونکی وجہ یہ تھی کہ علی مردان خان نے جو دولت خیانت سے جمع کی تھی اوسکو فضول خرچ کر کے اپنی شان اوسے دکھائی کہ جس بادشاہ کی امانت میں خیانت کی تھی اتنے وہ روپیہ نہیں چھین سکے جب وہ پڑھتا ہے کہ ان بادشاہوں میں سے بعض کے عہد میں جان و مال کی اسقدر سلامتی تھی کہ ہر مسافر کو اختیار تھا جہاں چاہے چلا جائے اور یہ کہ سونے کی تھیلیاں سڑکوں پر ڈال دی جائیں تو کوئی اونکو ہاتھ تک نہ لگائے تو اوس کو اس بات کے یقین کرنے میں شبہ پیدا ہوگا۔ اوسکے ساتھ یہ بھی تحقیق ہوتا ہے کہ اس عہد حکومت میں جو سب سے زیادہ پر زور تھا اور ملک کی اندرونی سلامتی ایسی تھی کہ جسکی نظیر پہلے نہ تھی۔ ایک قافلہ متھرا میں چند ہفتے تک اسلئے ٹھیرا رہا کہ اتنے آدمی جمع نہ ہوئے تھے کہ مضبوط ہو کر دہلی تک جا سکیں آگرہ کی فصیل ایسی بودی تھی کہ شہر کے باہر کے لٹیروں سے پناہ نہ تھی جو رات دن لوٹ مار کیا کرتے تھے سر فتح شیر کے شکار کھیلنے کی جگہ تھی۔ کڑہ اور کالپی میں ہاتھی کثرت سے موجود تھے۔ شہروں اور قصبوں کا اجڑنا جسکو بعض معترضین نے ہماری پالیسی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ہماری حکومت سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ بقول ہیبر کے اس ملک کو ایسا پایا کہ ملک برباد تھا شہر جلے پڑے تھے جب کہ غیروں کی اولاد فصیلیں بنانے اور اونکے بادشاہ حکم دینے آئے۔

اگر ہم دوسری نسبت عام طور پر غور کریں اور فرنگستانی اور ایشیائی سلطنتوں کے اوصاف کا مقابلہ کریں تو دریافت ہوگا کہ ان ہندوستانی تاریخوں کے پڑھنے میں ہمیں بہت سے مفید سبق حاصل ہوتے ہیں جو ہمارے دلوں میں اپنے ملک یعنی انگلستان اور اوسکی واجب التعظیم اصولوں و قوانین کی محبت اور قدر پیدا کرتے ہیں +

جب ہم ایک خود مختار ظالم سلطنت کے برباد کرنے والے افراد یا ایک مطلق العنان بادشاہ کے اندیشوں کو دیکھتے ہیں تو ہم میں ایک باقاعدہ حکومت کی قیمت کے جانچنے کی پوری قدرت پیدا ہوتی ہے جب ان مصیبتوں کو دیکھتے ہیں جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کو تخت کی منازعات میں پیش آتی ہیں تو ہمکو اس اصول وراثت کی قیمت معلوم ہوتی ہے جسکے قواعد منضبط ہوتے ہیں اور جنمیں کبھی کوئی جھگڑا یا شبہ بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں جس قدر مصائب ہیں کسی ملک میں نہیں۔ کسی ملک میں وراثت کے اسقدر جھگڑے اور تخت کے مدعی اتنے نہیں پیدا ہوتے ہیں اکبر کی موت سے لیکر انگریزوں کی فتح دہلی تک جو زمانہ دو سو برس کا ہے صرف ایک تخت نشینی ایسی ہوئی کہ جسپر جھگڑا نہ ہوا ہو اور اس مستثنیٰ مثال کی وجہ بھی یہ تھی کہ وہ تخت ہی کسی قابل نہ رہا تھا کہ تخت نشینی کا فساد اوٹھتا۔ کیونکہ اسکا زمانہ وہ بر او قت تھا جب نادر شاہ کی تباہیاں لوگوں کو یاد تھیں اور ابدالی دہشتیں میں سب کو گمان تھا کہ کوئی اور حملہ ہونے والا ہے آج تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ برائے نام بھی تخت شاہی بغیر ورثاء کے جھگڑوں کے نہیں رہتا اسکا فیصلہ ہی نہیں ہو۔ اگر دربار انگلستان کی مرضی اور برٹش گورنمنٹ کی خوشی تنازع پیدا ہونے سے پہلے کسی ایک شخص کے حق میں فیصلہ نہ کردے اور باقی ورثاء کے دل میں وہ امیدیں نہ پیدا ہونے دے جسکی وجہ سے ہمیشہ شاہی خاندان کے لوگوں کی جانیں اس حب جاہ و منصب کی قربان گاہ میں خون ہوتی ہیں۔

یہ تخت کی وراثت کا قاعدہ مقررہ نہ ہونے کا سبب تھا کہ سلطنت میں ہمیشہ شور شغب رہا اور ترقی کے رستے مسدود ہو گئے۔ یہ نہ ہوتا تھا کہ زندہ بادشاہ کی رائے کا کوئی شخص اسکا وارث و جانشین ہو گا ——— خود مختار سلطنتوں میں اگرچہ مطلق العنان بادشاہ کی مرضی قانون کا حکم رکھتی تھی لیکن مرنے کے بعد وہ مرضی اور حکم کسی بہادر سازشی رقیب کی دشمنی و دوستی شمشیر کی چمک کے ساتھ کچھ نہیں چلنے دیتی بڑے بیٹے کے جانشین ہونے کے اصول کی مقبولیت کی بہت وجوہ موجود ہیں اسی اصول اور

قانون سے جانشینی کے جھگڑون میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ ہونا اس قاعدہ پر مبنی نہیں ہے خاص کر ایسے ملک میں جہان کثرت سے بیویاں کرنے کی رسم موجود ہو بڑا بیٹا وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ دربار سے غیر حاضر رہتا ہے جسکے ساتھ گھر والون کو پہلے ہی ہمدردی جا سکتی ہے۔ اس کا کسی صوبہ کی گورنمنٹ پر حاکم ہونے کا اثر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ بادشاہ کے دل میں بہت سے وہم اور خطرے پیدا کرتا ہے تو ایسے بیٹے کے حقوق کسی جوان ملکہ کے خوش کرنے کے لئے فوراً تلف کئے جاتے ہیں جو چاہتی ہے کہ اپنے بیٹے کو صاحب تاج و تخت دیکھے۔ جب سوسائٹی کی یہ حالت ہوتی ہے تو شہزادے جانشینی کی رقابت میں پرورش پاتے ہیں یا آوارہ گرد دل و رقزاقوں کی طرح اٹھائے جاتے ہیں ملک کے سردار ایک ایک شہزادہ کے طرفدار ہو جاتے ہیں اور یہ کسی اصول یا حق کو برقرار رکھنے کی غرض سے نہیں بلکہ اسلئے کہ سب سے پہلے اپنے شہزادہ کی تخت نشینی سے نفع اٹھائینگے اور بادشاہ کے ہاں اپنا ذاتی رسوخ پہلے ہوگا اور پھر بڑھتے بڑھتے خود تخت پر بیٹھنے کی کوشش کرینگے۔ رعایا اس طرح سے بے پروا ہوتی ہے کہ کون تخت حاصل کرے البتہ نتیجہ کو اضطراب سے دیکھتی رہتی ہے تاکہ جب تخت نشینی کا فیصلہ ہو جائے تو تھوڑے دن اور امن اور محنت کی زندگی بسر ہو کر پھر نئے جھگڑوں سے آپس میں خلل پڑے۔ مختصر یہ کہ تمام جہان میں فوائد ملکی انسٹی ٹیوشن کم یا زیادہ عام استحکام اور استقامت نہ ہونے سے اثر پذیر نہیں ہوتے ہیں جو مسلسل فسادات کے جوشوں کے لازمی نتیجے ہیں ان صورتوں کے غور کرنے میں اور بہت سی کیفیتوں پر فکر کرنے میں ان کتابوں کے مستعد پڑھنے والے کو خود نظر آتی جائینگی۔ وہ جھگڑے جو اکثر شاہان گذشتہ کی نسبت دل میں رہتے تھے رفع ہو جائینگے اور پڑھنے والے پر ظاہر ہوگا کہ باوجود ہماری سول پولیسی اور خراب موسم کے جو ہمکو اس ملک میں ہمیشہ رہنے کے لئے گھر بنانے نہیں دیتا اور باوجود اسکے کہ ہمکو ذاتی نفع اس ملک کی ترقی سے نہیں باوجود اس امر کے کہ بہت سے عیوب بیرونی حکومت کرنے میں باقی ہونگے جہان زبان۔ رنگ۔ مذہب۔ رسوم جدا نہیں

سائنس اور فلوسوفی آف ہسٹری کی تعریف +

سب ایسے ہیں جو رعایا اور بادشاہ کو باہم وردی سے محروم رکھتے ہیں باوجود ان تمام حالتوں کے ہم نے اضعف صدی میں رعایا کو وہ عمدہ اور حقیقی نفع پہنچایا ہے کہ ہم سے پہلے بادشاہوں نے اس سے دس گنے وقت میں بھی اپنی رعایا کو ایسے ملک میں نہیں پہنچایا جسکو اونہوں نے خود اپنا وطن قرار دے لیا تھا زمانہ ماضی سے پیشین گوئی کر کے آیندہ کے لئے پڑہنے والوں کو امید ہو سکتی ہے کہ اس کامیابی کے جوش میں جو اسوقت تک ہم کو ہماری کوششوں میں ہوئی ہے ہم آیندہ بھی متواتر کوششوں کا خیال حاصل کر کے اپنے مقدر کو جس میں ہندوستان کی حکومت لکھی تھی پورا کرینگے -

ہم آگے لکھینگے کہ علم تاریخ سائنس یا فلوسوفی ہو سکتا ہے یا نہیں - اس فقرے میں دو انگریزی لفظ سائنس اور فلوسوفی کے موجود ہیں جنکے ہم معانی الفاظ مجھے اپنی زبان میں نہیں معلوم اسلئے میں انہیں کو استعمال کرونگا اسلئے اونکے اصطلاحی معانی جو ذرا دقیق ہیں بیان کرتا ہوں سائنس کے معنی یہ ہیں کہ حقائق محققہ کا علم جو دلائل عقلیہ پر مبنی ہو وہ علم عرفی یا ادنیٰ علم کو بدلائل بنا کے اعلیٰ درجہ کا علم بنا تا ہے وہ علل کے عمل کو مفصل بتاتا ہے اور یہ دکھلاتا ہے کہ واقعات کو کس طرح قوانین یا قواعد بناتے ہیں سائنس بہت سے مظہرات فطرت و منظرات قدرت کے نظم و ترتیب قاعدوں کو بیان کرتا ہے اور موجودات عالم کے اسرار کو نہایت تحقیق و تدقیق کئے انکشاف کرتا ہے - سائنس اور فلوسوفی ہم معنی ہیں مگر آسانی کے لئے انہیں یہ تمیز کر لی ہے کہ سائنس کو مادیات سے متعلق کر دیا ہے اور فلوسوفی کو عقلیات سے تاریخ کی فلوسوفی کے معنی یہ ہیں کہ واقعات اور اونکے اسباب و نتائج کے درمیان تعلقات کو بتلائیں - سائنس یا فلوسوفی کے لئے بکار آمد ہونا بھی ضرور ہے - اُس سائنس میں انسان ترقی کرتا ہے کہ جس سے اوسکا کام نکلتا ہے - اوسکو منفعت ہوتی ہے - اس منفعت ہی کا خیال طبیعت کو اسکا شوق اور اوسکی طرف توجہ دلاتا ہے اور اوسکی تحصیل کیطرف ہمت بلند ہوتا ہے - جہان سائنس یا فلوسوفی سے انسان کی مطلب برآری موقوف ہوئی اوسنے اوس سے ہاتھ اوٹھایا +

سائینس کے ساتھہ ایک لفظ آرٹ کا بھی بولا جاتا ہے یہ دو نو فن کی تحقیق کرتے ہین سائنس
کی تحقیقات علمیہ ہوتی ہے اور آرٹ کی تحقیقات عملیہ کسی چیز کی پیدائش کے واسطے
سائنس حقایق کا اجتماع کرتا ہے اور آرٹ عمل کی ہدایت کرتا ہے اور اوسکے قواعد کا مجموعہ
بناتا ہے سائنس مین یہ بحث ہوتی ہے کہ یہ ہے اور یہ نہیں ہے یہ واقع ہوتا ہے یہ نہیں واقع ہوتا
آرٹ میں یہ بحث ہوتی ہے کہ یہ کر داور اِسّے بچو۔ سائنس مظہرات عالم کے قوانین کو منکشف
کرتا ہے اور آرٹ ایک اثر کے پیدا کرنے کے لئے اسباب جمع کرتا ہے اور اوس کی
علت غائی بتاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سائنس معارف یقینیہ و علوم تحقیقیہ کا نام ہے اور
آرٹ اعمال یقینیہ و تحقیقیہ کا نام ہے۔ آرٹ کے معانی ہم نے اسلئے بیان کئے ہیں کہ
کہ کہیں ہم اوسکو بھی اپنی تاریخ میں کام میں لائینگے +

دنیا مین سیف قاطع ہمیشہ بڑے بڑے کام کرتی ہے پہلے زمانہ میں صرف برائی
دولت کو اپنا بنانے کا ذریعہ صرف تلوار ہی تھی۔ مگر زمانہ حال مین تلوار کی جگہہ اور بہت
سی چیزیں تہذیب نے ایسی ایسی ایجاد کر لی ہیں کہ وہ برائی دولت کو اپنا بنا لیتی ہیں
اور تلوار کی جگہہ کام دیتی ہیں مگر پہلے زمانہ میں شمشیر زنوں ہی کا درجہ سب سے زیادہ
اعلی سمجھا جاتا تہا اسلئے قدیم مورخوں نے انہی کے حالات پر تاریخ کا خاتمہ کیا تاریخ کے
ہزاروں صفحے لڑائیوں کے بیان میں اور اوسکے متعلقات کے ذکروں سے بھردئے
جن مورخون نے ایسی تاریخوں کو لکھا اونہون نے اپنے زمانہ میں کامیابی حاصل کی اور اُس
زمانہ مین جو تاریخ کا اصلی مقصد تھا وہ حاصل ہوا۔ لیکن زمانہ مین ہمیشہ انقلاب ہوتا رہتا ہے
کوئی بات اُس میں اپنی اصلی حیثیت نہیں رکھتی وہی باتیں جو اور زمانہ میں سرمایہ فخر و ناز
گنی جاتی تھیں وہی دوسرے زمانہ میں ہنسی کے قابل ہو گئیں۔ اس زمانہ میں جیسے پہلے
تاریخون کے عیب چھانٹے جاتے ہیں کہ انمیں یہ نہیں وہ نہیں جب سے وہ کیا خاک ہے
کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ ایسا زمانہ ترقی کا آئے گا اس زمانہ کی تاریخوں کی خاک اس طرح
اوڑائی جائے جیسی کہ ہم قدیمی تاریخوں کی اوڑا رہے ہیں میرے نزدیک قدیمی مورخوں کی

زمانہ حال میں تاریخی سامان

کوشش وسعی وعرق ریزی و دقیقہ سنجی پر نکتہ چینی عیب بینی مناسب نہیں - ہر چیز کو اوسکے
زمانہ کے موافق دیکھنا چاہتی ہے کہ اسمیں کونسی چیزیں قدر وقیمت رکھتی تہیں - زمانہ حال
مین تاریخ کے واسطے سامان عظیم الشان تیار ہوگیا ہے - فرنگستان اور بڑے بڑے ملکوں
کے حالات اور واقعات نہایت احتیاط سے جمع کئے گئے ہیں جن ثبوت پر وہ مبنی ہیں اونکی
بھی بخوبی تحقیقات ہوئی مذہب کی تاریخ پر بھی بخوبی توجہ ہوئی ہے علوم وفنون اور علم ادب اور
مفید ایجادوں اور آخرکار انسان کی آسایش اور آرام کے طریقوں پر بہت کچھہ محنت کی گئی ہے
زمانہ قدیم کے حالات دریافت کیئے ہیں پرانی باتوں کی تحقیقات کی - قدیم شہروں کی جگہوں کو کہود کر
دفینا کیا قدیمی سکے نکالے ہیں اور اونکو پڑہا ہے - پرانے کتبے ڈہونڈ ڈہونڈ کر نکالے ہیں اونکے
حروف ابھی پڑہ کر درست کئے گئے ہیں - جو زبانیں کہ حرفوں میں نہیں تحریر ہوتی تہیں بلکہ چیزوں کی
شکلوں میں لکہی جاتی تہیں اونکے معنوں کو دریافت کیا اور اونکے مطلب کو نکالا - جو زبانیں کہ
مدت سے فراموش ہوگئی تہیں اونکو بھی نئے سرے سے یاد کیا - انسان کی بول چال کے استعمال کے
قواعد اور اصول دریافت کئے - اور اوسکے ذریعہ سے انسان کی ابتدائی نقل مکانی کے
ایسے زمانہ دریافت کئے جو بالکل نامعلوم تہے علم انتظام مدن مدون ہوا اوسکی بدولت دولت
کی کمی وبیشی کے اسباب دریافت کئے ملکوں کے اور وہاں کے رہنے والوں کے حالات
بڑی بڑی محنتوں سے جمع کئے - اونکے نقشے بنائے انسان کے دنیوی کاموں اور اخلاقی
باتوں کا بہت کچھہ حال دریافت کیا مثلاً مختلف قسم کے جرموں کی تعداد اور ایک کی نسبت
بمقابل دوسرے کے اور ان پر جو اثر کہ زمانہ اور تعلیم کا صورت عود ہونے کے سبب سے ہوا
اوسکا اندازہ اور اور جو باتیں اوسکے متعلق ہیں وہ سب دریافت کی گئیں اسی کے ساتھہ جغرافیہ
طبعی بھی قدم بقدم چلتا گیا آب وہوا کے حالات کے نقشے تیار ہوگئے - پہاڑوں کی پیمایش ہوئی
دریا ناپے گئے اور اونکے مخرج دریافت ہوئے ہر قسم کی قدرتی پیداواریان اور اونکی
مخفی تاثیریں معلوم کیں ہر قسم کی خوراک کی جو انسان کی زندگی کو ضروری ہے علم کیمیا کے ذریعہ
تفتیش کی اوسکے اجزاء شمار ہوئے اور تولے گئے - اور جو نسبت اونمیں اور انسان کے جسم میں ہے

اسکی بخوبی تحقیقات کی گئی علی ہذا القیاس - انسان کے متعلق جو باتیں ہیں اُنکی ہر قسم کی تحقیقات ہوئی یہانتک کہ مہذب و شایستہ قوموں میں مرنے اور شادی کرنے پیدا ہونے اور پیشہ کرنے اور کاموں میں مشغول رہنے کا اور اجرت کی کمی و بیشی کا اور جو اشیاء کہ زندگی کے لیے ضرور ہیں اونکی قیمت کا اندازہ کیا گیا یہ سب واقعات اور اس قسم کے اور بہت سے حالات جمع کئے گئے ہیں اونکو درستی سے مرتب کیا گیا ہے اور اب وہ سب کام میں لانے کے لائق ہیں اونکے ساتھہ اور بھی مفید باتیں شامل ہیں کیونکہ صرف بڑی بڑی قوموں ہی کے افعال اور خاصیتیں لکھی نہیں گئیں بلکہ سیاحوں نے تمام دنیا میں جو اب تک معلوم ہوئی ہے سفر کیا ہے اوسکے تمام حصوں کی سیر کی ہے اور مختلف قوموں کو دیکھا ہے - اوسکے حالات دریافت کیے ہیں اب ہم اونکے ذریعہ سے تہذیب و شایستگی کے ہر درجہ کا اور ہر جگہہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنے ہمجنسوں کے حالات دریافت کرنے کا شوق کبھی کم نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہوتا جاتا ہے تو ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس شوق کے پورا کرنے کے وسیلے روز بروز اوسکے ساتھہ زیادہ ہوتے جاتے ہیں جو باتیں دریافت ہوئی ہیں وہ سب موجود اور محفوظ ہیں جب ہم ان سب باتوں کو یکجا کرتے ہیں تب ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے ہم واقف ہو گئے ہیں وہ کس قدر مفید ہیں اور ان کی مدد سے انسان کی کسقدر ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے - مگر جب یہ بات بیان کرنی چاہیں کہ ان سب باتوں سے کیا کام لیا گیا تو ساری یہ صورت بدل جاتی ہے - انسان کی تاریخ میں بہت بڑا نقص یہ ہے کہ گو تاریخ کے علیحدہ علیحدہ جزوں کی نہایت قابلیت سے تحقیقات ہوئی ہے لیکن کسی نے ان سب اجزا کو ملا کر ان سے ایک عام نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس طریقہ کو دریافت کیا جس کے ذریعہ سے ان تمام چیزوں کی آپس کی نسبت معلوم ہو یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ بڑی بڑی باتوں کی تحقیقات کے لئے جزئیات کا استقراء کر کے کلیہ نکالتے ہیں اور خاص خاص باتوں سے عام قاعدہ نکالنے میں بڑی بڑی کوششیں کی جاتی ہیں تاکہ وہ قاعدے دریافت ہوں جنکی رو سے وہ خاص خاص باتیں وقوع میں آتی ہیں

مگر موزخوں میں یہ طریقہ عام نہیں ہے ان کے دل پر ایک عجیب خیال ہے کہ وہ اپنا کام صرف
اسیقدر سمجھتے ہیں کہ واقعات کو اور گذرے ہوئے حالات کو بیان کر دیں اور کہیں کہیں اخلاق
اور انتظام مدن کی کچھہ کچھہ باتیں جنسے کچھہ فائدہ مقصود ہو لکھہ دیں ایسے مصنفوں کا جو خیال
کی سستی ہے یا قدرتی نا قابلیت نے اعلی درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں رکھتے یہ طریقہ ہے
کہ چند رسال تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور تاریخ لکھنے کی قابلیت بہم پہنچائی پھر بڑی بڑی
قوموں کی تاریخیں لکھنے لگے اور ان کی تاریخیں ان مضمونوں کے لیے سند ہو گئیں +

اس محدود اور تنگ طریقہ کے سبب ایسے نتیجے پیدا ہوے جن سے ہمارے علم کی ترقی کو
بہت نقصان پہنچا اس طریقہ کے سبب سے موزخوں نے ایسی وسیع ابتدائی تعلیم کو ضروری
نہیں سمجھا جسکے ذریعہ سے اس علم کی تمام قدرتی باتیں بالکل اونکی گرفت میں آجاویں اور اس
طریقہ کے سبب سے یہ نتیجہ ہوا کہ ایک مورخ تو علم انتظام مدن اور علم معاشرت سے نا واقف ہے
دوسرا آئین و قانون کچھہ نہیں جانتا کوئی مذہبی معاملات اور تبدل رائے کے حالات سے
محض نا واقف ہے کوئی فلسفہ مدنی کو نہیں جانتا — کوئی علم طبعی سے آگاہ نہیں حالانکہ
یہ سب علوم نہایت ضروری ہیں اسلئے کہ وہ خاص باتیں جنسے انسان کے مزاج اور اوسکے
اطوار پر اثر ہوتا ہے انہیں علوم سے پیدا ہوتی ہیں اگرچہ ان علموں میں سے ایک شخص کسی علم کو
سیکھتا ہے اور دوسرا کسی علم کو مگر بعوض اسکے کہ وہ سب علوم ایک شخص میں ملائے جائیں متفرق ہو جاتے
ہیں اور جو مدد کہ مشابہت اور مماثلت کی ایک شخص میں ان سب علوم کے جمع ہونے سے
حاصل ہو سکتی تھی وہ ضایع ہو جاتی ہے اور اسی سبب سے کسی شخص نے ان سب علوم کو
تاریخ میں ملانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ وہ سب تاریخ کے اجزاء ہیں +

ہاں البتہ اٹھارہویں صدی کے شروع سے چند عاقل پیدا ہوگئے جنہوں نے
تاریخ کے اس نقص پر افسوس کیا اور حتی الوسع اسکی اصلاح کی کوشش کی مگر یہہ مستثنا ایسے
نہایت کم ہیں یہانتک کہ یورپ کے تمام علم ادب میں اصل کتابیں تین چار سے زیادہ نہیں
ہیں جن میں انسان کی تاریخ کی تحقیقات ان عمدہ اور عالم طریقوں پر کی گئی ہو جن سے

سائنس کی اور شاخوں میں کامیابی ہوئی ہے سولھویں صدی کے بعد سے اور خصوصاً
آخر صدی کے مورخوں میں خیال کی وسعت کے نشان اور اپنی تصنیفات میں ایسے مضمونوں کے
شامل کرنے کا شوق پایا جاتا ہے جنکو انسے پہلے وہ چھوتے بھی نہ تھے اس سے ایک عمدہ
بات پیدا ہوتی ہے اور ایک قسم کی واقعات جمع ہونے سے قاعدہ کلیہ نکالنے کا خیال
پیدا ہوا جسکا نشان یورپ کے قدیم علم ادب میں نہیں پایا جاتا اس بات سے بہت بڑا فائدہ
ہوا کیونکہ مورخوں کے خیال نے وسعت پائی اور غور کرنے کی عادت پڑی جو اصلی
واقفیت کے لئے ضرور ہے کیونکہ بغیر اسکے کوئی سائنس نہیں بن سکتا۔

اس زمانہ میں اگرچہ بہ نسبت زمانہ سابق کے تاریخ کے آثار زیادہ طمانیت کے لائق موجود ہیں
مگر سوائے چند مثالوں کے وہ سب اب تک آثار ہی آثار ہیں آجتک ان اصولوں کے دریافت
کرنے میں جنکا اثر قوموں کی قسمت اور انکی چال چلن پر ہوتا ہے بہت کم کوشش ہوئی
ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ انسان کے اعلیٰ خیالات کے لیے اب بھی تاریخ بہت ہی ناکامل ہے
اور وہ ایسی ہی بے ترتیب صورت میں ہے جیسے کہ اس مضمون کی صورت ہوتی جسکے قاعدے
معلوم نہیں ہوئے ہیں اور جسکی جڑ قائم نہیں ہوئی۔ ہمارے پاس تاریخ کا اسقدر سامان موجود ہے
کہ اگر اسپر زیادہ کوشش کی جائے تو جسطرح کہ علوم طبیعی کے مختلف شاخیں تحریر ہوئیں اسطرح
انسان کی تاریخ بھی تحریر ہو سکتی ہے نیچر کے اکثر باتیں جو ظاہرا بالکل بے قاعدہ معلوم
ہوتی ہیں اور کبھی یکساں نہیں رہتی سمجھ میں آگئی ہیں اور یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وہ
بھی عام قواعد معین کے بموجب ہوتی ہیں۔ قابل لوگوں نے نہایت تامل و غور سے طبعی واقعات
پر اس غرض سے توجہ کی ہے کہ ان کے قاعدے معلوم ہوں اور اسی غور و تامل کا یہ نتیجہ
حاصل ہوا ہے پس اگر انسان کے واقعات کو اسی طور پر دیکھیں تو بے شک ویسے ہی نتیجے حاصل
ہونگے اور یہ بات کہدینی کہ تاریخ کے واقعات سے کلیہ قاعدہ نہیں نکل سکتا ایک امر کو بغیر تحقیقات کے
بلا ثبوت کے تسلیم کر لینا ہے اس قسم کے لوگ صرف ایسی ہی بات کو تسلیم نہیں کرتے جسکو ثابت
نہیں کر سکتے بلکہ ایسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں جو علم کی موجودہ حالت میں نہایت غیر ممکن ہیں

جو کوئی شخص آخیر دو صدی کے حالات سے واقف ہوگا وہ ضرور جانتا ہوگا کہ ہر ایک پشت میں کسی نہ کسی ایسے واقعہ کا باقاعدہ ہونا ثابت ہوتا جاتا ہے اور اوسکی نسبت پیشین گوئی ہو سکتی ہے جس کو پہلے پشت کے لوگ محض بے قاعدہ اور ناقابل پیشین گوئی سمجھتے تھے پس تہذیب و شائستگی سے جو ترقی پائی جاتی ہے ہمارا بالیقین مضبوط ہوتا جاتا ہے کہ سب باتیں باقاعدہ اور ترتیب وار ہوتی ہیں پس ان باتوں سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی قسم کے واقعات کا قاعدہ دریافت نہیں ہوا ہے تو ہمکو یہ نہ کہنا چاہئے کہ یہ بے قاعدہ ہیں بلکہ ہم پہلے کے تجربے کو لحاظ کر کے یہ تسلیم کرنا چاہے کہ جو بات اسوقت سمجھ میں نہیں آتی ممکن ہے کہ آیندہ زمانہ میں سمجھ میں آجاوے بے ترتیبی میں سے ترتیب نکالنے کی امید اس درجہ تک ہوتی ہے کہ اکثر نامور عالموں کو بعوض امید کے یقین ہوتا ہے اور اگر یہی امید مورخوں میں نہ پائی جاوے تو اسکا سبب یہی سمجھنا چاہے کہ وہ لوگ نیچر کے محققوں کی بہ نسبت کمتر لیاقت رکھتے ہیں اور اور کسی قدر یہہ بھی سبب ہو سکتا ہے کہ معاشرت کی باتیں جو تاریخ سے علاقہ رکھتی ہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں +

یہی اسباب ہیں جنہوں نے اب تک علم تاریخ کو ایک علم ہونے نہیں دیا نہایت مشہور اور نامور مورخ علم طبعی جاننے والے کے مقابلہ میں کچھ بھی درجہ نہیں رکھتا ہے کسی ایسے شخص نے تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی جو ذہن و عقل میں مثل کیپلر و نیوٹن کے وحید عصر ہوئے اگرچہ موجودات کے حالات بھی نہایت پیچیدہ ہیں مگر جو مورخ فلسفہ کے طور تاریخ لکھتا ہے اوسکو نیچر کی تحقیقات کرنے والے کی نسبت زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں کیونکہ اوسکے تجربہ میں وہ غلطیاں ہو سکتی ہیں جو تعصب اور جوش سے پیدا ہوتی ہیں اور سامان تجربہ کا جو نیچر میں ہے کہ اوسکے ذریعے ہم دنیا میں نہایت پیچیدہ مسئلوں کو حل کر لیتے ہیں وہ سب سامان مورخ کے کام میں نہیں آسکتے +

پس اس بات کا کچھ تعجب نہیں کہ انسان کے افعال کا علم بہ نسبت نیچر کے علم کے بچپنے کی حالت میں ہے

بے شک ان دونوں علموں کی ترقی میں اتنا بڑا فرق ہے کہ علم طبیعی کی ایسی باتوں کو جو اب تک
ثابت بھی نہیں ہوئیں لوگ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ضرور با قاعدہ ہونگے اور اونکی نسبت پیشین گوئی
بھی کرتے ہیں مگر تاریخی واقعات کا با قاعدہ ہونا کوئی تسلیم نہیں کرتا بلکہ اوس سے انکار کرتے
ہیں اس سبب سے جو شخص کہ علم تاریخ کو مثل دیگر علوم کے ترقی دینا چاہتا ہے اوسکو ابتدا ہی
میں ایک بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ اوس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے معاملات میں کچھ اسرار
ہیں اور وہ اسرار خدا ساز ہیں کہ ہماری عقل اور ہماری تحقیقات ان تک نہیں پہونچ سکتی
اور انسان کے آیندہ کے حالات ہمیشہ پوشیدہ رہینگے۔ اس کے جواب میں صرف اسقدر
کہنا کافی ہے کہ ایسا کہنا صرف تحکماً تسلیم کرنا ہے کیونکہ اسکا ثبوت کچھ نہیں ہے اور اس
مشہور حقیقت کے مخالف ہے کہ جہاں علم بڑھتا جاتا ہے وہاں قاعدہ اور سلسلہ میں بھی زیادہ
یقین ہوتا جاتا ہے اور اس قاعدہ کے بموجب یکساں حالت میں ایک سے نتیجے پیدا
ہوتے ہیں بہتر ہے کہ ہم اس عقیدہ کے حل کرنے میں زیادہ غور کریں اور اس بات کو دیکھیں
کہ لوگونکی جو یہ عام رائے ہے کہ تاریخ کبھی سائنس یا فلوسوفی کے درجہ پر نہیں پہنچ سکتا
اوسکو سائنس کہنا ایسا ہے جیسے کہ یہ کہنا کہ آواز میں رنگ ہے اور اربعہ متناسبہ کا طول
و عرض ہے اوسکی بنیاد درست ہے یا نہیں جب ہم اسکا خیال کرتے ہیں تو ہمارے دل میں
ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے جو اسکی جڑ ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ آیا انسان کے
افعال اور انسان کی باہمی معاشرت کے کام کسی قانون معین کے تابع ہیں یا اتفاقیہ ہیں
اور ایسی باتوں کے نتیجے ہیں جو انسان کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں ان امور کی بحث میں
چند مفید خیال پیدا ہوتے ہیں کیونکہ جو سوال کیا گیا ہے اوسکے متعلق دو مسئلے ہیں جنکے
ذریعے سے تہذیب کے مختلف درجے ظاہر ہوتے ہیں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تمام امور اتفاقیہ
واقع ہوتے ہیں اس سند کے بموجب گویا ہر ایک واقعہ علیحدہ اور تنہا واقع ہوتا ہے اور کسی
امر اتفاقیہ کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے ایسا خیال بالکل ایک جاہل و وحشی شخص کو ہوتا ہے
اور پھر جوں جوں تجربہ بڑھتا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب باتیں با قاعدہ ایک

کے بعد ہوتی ہیں تو یہ خیال مضمحل ہو جاتا ہے مثلاً وحشی قومیں جن میں تہذیب کا اثر کچھ بھی
نہیں معلوم ہوتا اور جو صرف شکار پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو بلا شک یہ خیال
ہو سکتا ہے کہ ہماری ضروری خوراک کا ملنا صرف کسی امر اتفاقی کا نتیجہ ہے جو بیان
نہیں ہو سکتا چنانچہ شکار کبھی ملتا ہے اور کبھی نہیں ملتا کبھی افراط سے ملتا ہے
اور کبھی نہایت کم اور اسی سبب سے انکو کبھی شبہ بھی اس بات کا نہیں ہوتا کہ نیچر کے
انتظام میں ترتیب کبھی ہے اور نہ ان کے دل میں ان تمام اصولوں کا وجود سما سکتا
جنکی رو سے تمام واقعات وقوع میں آتے ہیں اور جن اصولوں کے علم سے ہم انہیں
باتوں کی آیندہ حالت کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے ہیں مگر جب یہی قومیں کچھہ ترقی
کر کے کسانوں کی حالت میں آ جاتی ہیں تو وہ پہلے پہل ایسی خوراکیں کھاتی ہیں جنکا ملنا
بلکہ اسکا پیدا کرنا بھی وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ دیکھتی ہیں یعنے جو کچھہ بوتے ہیں وہی کاٹتے
ہیں ان کی ضرورتوں کے ضروری سامان زیادہ تر اونکے اختیار میں ہو جاتے ہیں اور
انہیں کی محنت کے نتیجے پیدا ہوتے ہیں جبکہ وہ بیج زمین میں بوتے ہیں اس سے درخت پیدا ہوتے ہیں وہ پھولتا
ہے پھلتا ہے بالیں نکلتی ہیں جب وہ پختہ ہو جاتی ہیں تو ان سے وہی غلہ نکلتا ہے جو بویا
تھا اور اوس کو اس بیج سے بھی جو بویا تھا کچھہ مناسبت ہوتی ہے ان باتوں سے اونکو
صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسمیں کوئی تدبیر اور حکمت ہے یہ نتیجہ ہمیشہ یکسان ہوتا ہے
اب اونکو آیندہ کے لیے گو یقین نہ ہو مگر ایک قسم کا اعتبار اور بھروسہ پڑ جاتا ہے اور یہ
اعتبار اوس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو ان کو اپنی اس پہلی اور غیر معین حالت میں تھا۔ اسی
اونکو ایک دھندلا سا خیال اس بات کا پیدا ہوتا ہے کہ واقعات میں کچھہ تسلسل اور استحکام
ہے اور کچھہ کچھہ وہ باتیں سمجھہ میں آنے لگتی ہیں جنکو آخر کار نیچر کا قانون کہتے ہیں اس طرح
ترقی کے ہر ایک قدم پر اسکا خیال صاف ہوتا جاتا ہے جسقدر اونکی تحقیقات بڑہتی ہیں
اور تجربہ زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اوسیقدر اونکو قاعدہ و سلسلہ اندر واقعات میں باہم
موافقت ملتی جاتی ہے جنکے وجود کا اونکو پہلے شبہ بھی نہ تھا اونکے ظاہر ہونے سے وہ

واقعات کے اتفاقیہ ہونے کا جو شروع میں اونکے دل میں بیٹھا ہوا تھا بودا ہوتا جاتا ہے تھوڑی ہی اور ترقی کے بعد استدلال کا شوق دل میں پیدا ہوتا ہے اور اونمیں سے بعض لوگ اپنی تحقیقات کے نتیجے نکالتے ہیں اور اگلی رائے سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور

یہ یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک پچھلا واقعہ اپنے پہلے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے اور پہلے کا واقعہ اپنے سے پہلے واقعہ سے اسی طرح ساری دنیا ایک زنجیر ہے اور ہر ایک آدمی ایک سلسلہ میں اپنا کام کرتا ہے پر وہ اس بات کا تعین نہیں کہہ سکتے کہ وہ کام کیا ہوگا

غرض ڈیڑھ سو برس سے اس باب میں کوشش ہو رہی ہے کہ تاریخ کو کسی طرح سے سائنس بنائیں اور اس میں یہ بتائیں کہ انسانیت کا برو سے کار آنا اور انسان کے خیالات اور تصورات میں ترقیوں کا ہونا بموجب قوانین کے کس طرح ہوا پہلے مورخ فقط واقعات بیرونی کے ہوتے تھے اب مورخ اندرونی خیالات کے ہوتے ہیں اور تاریخ میں یہ بتاتے ہیں کہ بیرونی واقعات اندرونی خیالات پر اور اندرونی خیالات بیرونی واقعات پر اپنا اثر کیا دکھلاتے ہیں تاریخ کا سامان ایسا جمع کر لیا ہے کہ جیسے کسی اور سائنس میں جزئیات سے استقرا کرکے کلیات کا حکم لگاتے ہیں اسی طرح تاریخ کے جزئیات سے کلیات استنباط کرتے ہیں اور اسکو کوئی سائنس بناتا ہے کوئی فلسفہ۔ گو ابھی یہ مقصد پورا نہیں حاصل ہوا مگر آخر کو کامیابی کی شکل نظر آتی ہے۔ پروفیسر سیلی ایک بے نظیر مورخ انگلستان کے ہیں اونکی اس لکچر کا چند صفحہ ترجمہ کرتا ہوں جو اونھوں نے انگریزی تاریخ کے میلان پر دیا ہے لکچر سے یہ باتیں معلوم ہونگی اول تاریخ کو اس طرح پڑھنا چاہیے کہ کوئی عملی فائدہ ہو دوم تاریخ میں وہ باتیں بیان ہونی چاہئیں جو سٹیٹ پر عمل کریں باقی تہذیب (سوی لزیشن) کی داستانیں جن کا بیان بتعلق ادبیات اور تشبیہات میں زبان کی فصاحت کو جتکا نام ہے تاریخ میں کوئی درجہ عظیم نہیں رکھتا سوم وہ تاریخ جو قدیم مورخوں نے لکھی ہیں وہ بمقتضائے زمانہ لکھی ہیں +

پروفیسر سیلی انگریزی تاریخ کا میلان

یہ میرا عزیز اصول ہے کہ جب تاریخ اپنی اسلوب میں سائنٹفک ہو تو اسکا مقصود کوئی

عملی بات ہونی چاہئے یعنی تاریخ کا صرف یہی کام نہ ہو کر پڑھنے والے کو جو زمانہ ماضی کے علم کا شوق ہے وہ پورا ہو جاوے بلکہ اوسکو یہ چاہئے کہ جو خیال زمانہ حال کی نسبت اور جو اندازہ زمانہ آئندہ کا وہ کر سکتا ہے انکی اصلاح کرے۔ اگر یہ اصول درست ہے تو تاریخ انگلستان کو ایسی چیز پر ختم ہونا چاہئے جس سے کوئی اخلاقی نتیجہ پیدا ہوتا ہو کوئی معتد بہ نتیجہ تاریخ میں پیدا ہونا چاہئے۔ تاریخ کو چاہئے کہ انگریزی معاملات کے عام رجحان کو اسطرح پر دکھلائے کہ ہم مستقبل کے خیال میں مصروف ہو جائیں اور ان باتوں کو بجا لائیں جو تقدیر میں ہمارے لئے مخصوص ہیں خاصکر اس وجہ سے کہ اس وقت دنیا میں جو کام ہمارا ملک کر رہا ہے۔ وہ کام جسقدر تاریخ ترقی کرتی جاتی ہے کم ممتاز نہیں ہوتا جاتا۔ بعض ممالک جیسے ہولنڈ اور سویڈن ہیں وہ اپنی تاریخ کو ایک طرح پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ختم کر چکے ہیں کسی زمانہ میں یہ ممالک بڑے ہی محتشم تھے لیکن جو صدیاں اونکی بزرگی کی تھیں وہ گذر گئیں اور اب اونکی حیثیت دوسرے درجہ کی ہے۔ اگر انکو اپنے عہد ماضی میں کچھ دلچسپی ہے تو وہ یا تو فقط خیالی ہے یا محض سائنٹفک ہے۔ عملی سبق جو اونکی تاریخ سے ملتا ہے وہ تو کلیۃً ہار بیٹھنے کا سبق ہے لیکن انگلستان برابر ترقی کئے گیا ہے اگر ہمیشہ یہ ترقی یا نسبت ہمیں ہے تو بہ ابتدا اوسکو ترقی ہوئی ہے۔ انگلستان اسوقت اٹھارہویں صدی سے زیادہ ہے اور اٹھارہویں صدی میں سترہویں صدی سے بدرجہا زیادہ تھا اور سترہویں میں سولہویں صدی سے زیادہ تھا۔ جو عظیم الشان بزرگی اسکو حاصل ہوئی ہے اسنے اس سوال کو کہ آئندہ اوس کی کیا صورت ہوگی بہت غور اور تشویش کے قابل کر دیا ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ ہماری سلطنت کو ممالک مقبوضہ کی وسعت نے بہت سے ایسے نئے مخطرات میں ڈالدیا ہے جن سے ہمارا ملک پہلے جبکہ اوسکو علیحدگی حاصل تھی اور شہرت نہ تھی آزاد تھا۔

اس لئے انگلش ہسٹری میں دلچسپی جوں جوں وہ اختتام کے قریب پہونچے زیادہ ہونی چاہئے اور چونکہ مستقبل ماضی سے پیدا ہوتا ہے اسلئے انگلستان کی قدیمی تاریخ کو اپنے ملک کی آئندہ حالت کی نسبت پیشین گوئی کرنی چاہئے۔ لیکن عام مورخین کو

شکل سے بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوتا۔ کیا حکیم ارسطو نے یہ نہیں کہا کہ ڈراما کو تو ختم ہونا چاہئے لیکن رزمیہ نظم ناتمام رہتی ہے جو انگریزی تاریخ عام مذاق میں لکھی جاتی ہے۔ ایسی صرف یہی نہیں ہوتا کہ کوئی اسکا انجام نہ ہو بلکہ وہ رفتہ رفتہ اس طرح سے تمام ہوتی ہے کہ مضامین ختم کے قریب ضعیف اور بے لطف ایسے ہو جاتے ہیں کہ بجائے اس خیال کے کہ انگلستان نے مسلسل قوت میں ترقی کی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک یا دو صدی سے وہ محض پیرانہ سالی کی وجہ سے دم توڑ رہا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے۔ کیا چشمہ کو اس طرح سے بہنے دینا چاہئے کہ بلا بان ریگ میں اسکا پانی بخارات بنکر اڑ جاوے۔ اس سوال میں شاعر ورڈزورتھ کے اشعار یاد آتے ہیں شاعر کہتا ہے +

کہ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ برٹش آزادی کے سیلاب کو جو ظلماتی قدامت سے بہتا ہوا دنیا کی تعریف کے کھلے سمندر میں بڑے زور شور سے شامل ہوتا رہا ہے جس نے اکثر یہ صورت اختیار کی کہ تعریف اور ہیچ کے جو بندہ سدرلہ ہوئے اون کو ٹھیر جانا تو کیا ایسے مشہور چشمے کو کیچڑ اور ریت میں غارت ہونے دینا چاہئے کہ برائی اور بھلائی دونو پر اس کا عدم وجود ایک ہو جاوے +

یہ افسوسناک انجام جسکا خیال تک نہ کرنا چاہئے بالکل وہی ہے جو برٹش آزادی کے چشمہ کا نہیں ہے تو اس چشمہ کے عکس کا تو ضرور ہے جو ہماری عام کتب تواریخ میں دکھلایا جاتا ہے +

اب اگر ہم فرض کریں کہ ہمکو اس نقص کا تدارک کرنا ہے تو ایسی صورت میں ہمکو کیا کرنا چاہئے۔ جو طلبا تاریخ پڑھتے ہیں اونکے لئے شروع سال میں جبکہ شاید اون کو نیا کورس شروع کرنا ہو یہ سوال چھوٹا سوال نہیں۔ تم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم سول انگلش ہسٹری پر سمجھ کر غور کرو اور دیکھو کہ اوسکے کچھ معنی ہیں کوئی مسلسل اسلوب تمہاری سمجھ میں آتا ہے یا نہیں یا کوئی نتیجہ جو اس سے پیدا ہوتا ہے تم نکال سکتے ہو یا نہیں۔ ابھی تک تو تم نے نام اور تاریخیں بادشاہوں کے شجرے اور لڑائیوں کی فہرستیں یاد کی ہونگی لیکن علاوہ

وقت آیا ہے کہ جب تم اپنے دل مین سوال کروگے کہ آخر یہ سب کس لئے ہے۔ اسکا مقصود
کیا ہے۔ وہ کونسا عمل مقصد ہے جسکے لئے یہ واقعات جمع کرکے برزبان کئے گئے ہیں
اگر یہ واقعات ایسے بڑے حقائق کی طرف رجوع نہیں کرتے جن میں سائینٹفک عمومیت
بھی ہو اور بڑے علمی نتیجے پیدا ہون تو علم تاریخ بمشکل سے ان علوم مین ممتاز رہ سکتا
ہے جنکی تحصیل کی عام کشمکش ہے +

تاریخ کو مدت تک مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جسکے تصور میں پروگریس
(ترقی) اور قطعاً آپ منٹ (بروے کار) کا خیال آسیب بنکر ہر گھڑی نہ موجود رہا ہو
ہم سب حرکت مین ہین۔ ہم مین سے ہر ایک اور ہم سب ملکر آگے بڑھ رہے ہین انگلستان
اس وقت وہ نہین ہے جو سلاطین سٹیورٹ اور ٹیوڈرز کے زمانہ مین تہا۔ اور ان آخر
کی صدیون مین اس خیال کی معاون بہت سی باتیں ہیں کہ ہماری حرکت ترقی کی حرکت
ہے یعنی بہتر چیزوں کی طرف ہم بڑھتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اس حرکت کی ہم تعریف
کیونکر کرین اور اوسکی مقدار کا اندازہ کرنے کی کیا ترکیب نکالین اگر ہم تاریخ کو اس
تحقیق اور عقل کے جوش میں ایک مقرر اور مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے جیسا کہ
مین نے آپ کو ابھی بتایا ہے مطالعہ کرنا چاہیں تو ہم کو مذکورہ بالا سوال پر اپنی طبیعت
کو جما کر اس کو کسی طرح حل کرنا فرض ہوگا۔ ہم کو ان غیر واقعی رنگین بیانون پر مطمئن نہ ہونا
چاہیے جو پرانے زمانہ کے مورخین تاریخ ختم کرنے کے وقت محض مذہبی رسم کی
وجہ سے بیان کرتے تھے اور جو میرے خیال میں اپنے تئیں قصہ نویسی میں گم کر دیتے ہیں
— یہ نہایت رنگین بیانیان ترقی تہذیب کے ذکر مین عموماً صرف کی جاتی تہین تہذیب
یا سیولیزیشن کی کوئی تعریف یا حد بیان نہیں کی جاتی تھی۔ اسکو استعارہ کی زبان
مین بیان کیا جاتا تہا کہ وہ روشنی ہے۔ دن ہے جسکا نور صبح کاذب اور صادق کی روشنی
سے بڑھتے بڑھتے نصف النہار کی ضیا تک پہونچ جاتا تہا۔ زمانہ تہذیب کا مقابلہ اس بعید
اور ناقص الحد زمانہ سے کیا جاتا تہا جسکو عہد ظلمت کہا جاتا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ تہذیب

جسکو دن سے تشبیہ دی جاتی تھی اوس کی روشنی ہمیشہ تیز ہوتی جائیگی یا جیسی دن کی
طرح دوپہر کی چمک سے کم ہوکر شام کی تاریکی میں غائب بھی ہوسکیگی یا اس کا خاتمہ
اس طرح ہوسکتا ہے کہ دفعتاً کوئی گہن اسکو گہنا لے گا۔ جیسا کہ قدیم دنیا میں تہذیب کی
روشنی کا ظاہراحال ہوچکا ہے (غالباً مصنف کی مراد یونان اور روم کی تہذیب سے
ہے جو غیر مہذب لشکر کشوں نے غارت کی)، ان سب باتوں کو ایسی تاریکی میں رکھا گیا
جو ایک غیر سنجیدہ مسئلہ کی شان کے لئے زیبا تھی اور اس مسئلہ کا وجود بھی اس غرض
سے تھا کہ بیان کو زیور بلاغت سے مرصع کیا جاوے +

یہ مسئلہ تہذیب ناقص استدلال کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اوسمیں حادثات
و مظہرات کا ایک انبار ہوتا ہے جنکی ایسی صورت میں حل کرنا پڑتا ہے جبکہ اتنا بھی نہیں
معلوم ہوتا کہ وہ کل مظہرات ہم جنس بھی ہیں یا نہیں لیکن چونکہ وہ شامل ہوکر ایک دفعہ
بھی خیال میں آتے ہیں اسلئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تم ایک لفظ اونکے لئے کہدیتے ہو۔
اور وہ لفظ کیا ہوتا ہے گویا جال ہوتا ہے جس میں کل چیزیں پھنسکر اکٹھی ہوجاتی ہیں ۔
تمہاری بڑی احتیاط یہ ہوتی ہے کہ لفظ تہذیب کی تعریف سے بچے جاؤ لیکن جب اس لفظ
پر گفتگو کرتے ہو تو اوسکو استعاروں میں بیان کرتے ہو جسکا مطلب اسطرح سمجھا جاتا ہے
کہ تہذیب یا سیویلیزیشن کوئی زندہ قوت لامعلوم اور غیر محدود خواص کی ہے جسکی طرف محض
حوالہ دینا اس بات کے لئے کافی ہے کہ نہایت عجیب اور غیر متشابہ نتائج کو حل کردیا۔ لفظ
تہذیب یا سیویلیزیشن ہیسے حادثات کو حل کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا جن میں ظاہرا
باہمی تعلق بھی سوائے اسکے کچھہ نہ ہوتا تھا کہ تاریخ میں وہ اکثر پاس پاس بیان ہوئے
تھے۔ ان حادثات میں بعض دفعہ تو آداب اخلاق کی صلاحیت شامل ہوتی تھی۔ بعض دفعہ
جر ثقیل کی ایجادیں۔ بعض دفعہ شاعروں اور صناعوں کا دنیا میں ظاہر ہونا بعض دفعہ
سائنٹفک تحقیقات بعض دفعہ ملکی آزادی۔ یہ فرض کیا جاتا تھا۔ اگرچہ کبھی ثابت نہ ہوسکا کہ یہ
سب چیزیں ایک دوسرے سے متعلق اور وابستہ ہیں اور ان چیزوں کا اس طرح سے ہونا

سیویلیزیشن کی روح کا کام ہے +

ہم یہی سیویلیزیشن کے مسئلہ کو لیتے ہیں اور اوسکو زیادہ مربوط اور مسلسل صورت میں دکھاتے ہیں ہم فقط آزادی خیال کے اصول سے چلتے ہیں اور کل وہ نتائج اس سے پیدا کر دینگے جو اس سے لازم آتے ہیں۔ سائنٹفک تحقیقات اور جر ثقیل کی ایجادیں اسی سے پیدا ہو سکتی ہیں اگر چند اور شرائط بھی موجود ہوں۔ یہ تحقیقات اور ایجادیں جب عام استعمال میں آئینگی تو انسانی زندگی کی صورت کو تبدیل کر دیں گی اور اسکی زندگی کو موجودہ پیچیدہ صورت میں دکھلائینگی اس تبدیلی کو ہم سیویلیزیشن کی ترقی کہینگے۔ لیکن پولٹیکل آزادی کو ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ایتھنز میں افلاطون اور ارسطو سے پہلے آزادی تھی لیکن بعد کو وہ جاتی رہی روم میں اسوقت کہ خیال میں بھدا پن اور جہالت تھی آزادی موجود تھی۔ مگر جب محکومیت آئی تو خیال روشن ہو گیا۔ شاعرانہ کمال کو خیال کی آزادی سے کچھ علاقہ نہیں کیونکہ ایتھنز میں فلسفہ کی ترقی کے ساتھ شاعری کا تنزل ہو گیا۔ شاعر ڈانٹی ملک اٹلی کے زمانہ رینا سانس (یعنی نیا جنم) سے پہلے پیدا ہوا۔ اور رینا سانس کے بعد کوئی ڈانٹی نہ پیدا ہوا +

اگر ہم اس غیر واضح مجموعہ کے اجزاء کو جسے سیویلیزیشن کہتے ہیں تحلیل کریں تو اس مجموعہ کا بڑا حصہ تو وہ ہوگا جو لفظ سیویلیزیشن سے پیدا ہوگا یعنی نتیجہ اوس انسانی اتحاد کا جو سول جماعتوں اور سٹیٹ میں ہو۔ دوسرا حصہ جو ہوگا اوسکا تعلق پہلے حصہ سے بعید کا ہے اور قریب کے واسطہ میں جن اسباب سے یہ دوسرا حصہ پیدا ہوتا ہے وہ جداگانہ ہیں مثلاً سائنس کی ترقی کی نسبت سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ سیویلیزیشن کا خاص جزو ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا ہے۔ سائنس کی ترقی سول سلامتی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ نہیں چلتی، البتہ اسکے لئے سول سلامتی کی ایک قلیل مقدار موجود ہونی ضرور ہے۔ انسان کی قسمت کا وہ حصہ جسکو قوانین یا

سلاطین پیدا کرتے ہیں اور اونہیں اصلاح کر سکتے ہیں وہ حصہ بہت محدود ہے -
تاریخ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے احاطہ عمل کو وسیع رکھے یا تنگ - خواہ انسانی سلامتی
کے کل اسباب کو یکساں تحقیق و دریافت کرے - خواہ صرف سول کمیونٹی سے علاقہ
اور انسان کی سلامتی اور بہبودی سے جسکا انحصار سول کمیونٹی پر ہوتا ہے واسطہ
رکھے - لیکن مدت سے یہ آخیر طریقہ عموماً اختیار کیا جاتا ہے - مشہور تاریخیں جو لکھی
گئی ہیں اون کو پڑھو گے تو معلوم ہوگا کہ سٹیٹ - گورنمنٹ - اور اونکی اندرونی
ترقی اور باہمی تعلقات اور معاملات ان تاریخوں کے مصنفین نے جانکر یا انجانی سے
ہمیشہ مدنظر رکھے ہیں - یہ سچ ہو سکتا ہے کہ اسطرح کے معاملات انسانی معاملات میں
ہمیشہ بڑے اور قابل قدر نہیں ہوتے - یونان کا مورخ تھیوسی ڈائیڈیز جس زمانہ
کا حال لکھتا ہے اس زمانہ میں جو واقعات سب سے زیادہ شان رکھنے والے ہیں وہ حکیم
سقراط کی حکمت اور فیداس صاحب صنعت کی ہنرمندیوں کے حالات ہو سکتے تھے
لیکن مورخ نے انکا ذکر تک نہ کیا البتہ لڑائیوں اور سازشوں کے حالات کو جو اب خفیف
معلوم ہوتے ہیں بہت وسعت دی ہے - اسکی وجہ مورخ کی تنگ خیالی نہ تھی - اوسنے
ایتھنز دار الخلافہ یونان کا حال لکھا اور اپنے شہر کی شوکت پر آگاہ تھا لیکن جس حد
پولیٹیکل اسباب سے اس دار الخلافہ کو بزرگی حاصل تھی اسپر بحث کی (باقی حالات
کے بیان سے پرہیز کیا) شہر کے ذکر کو ارادۃً اور خاص غرض سے محدود رکھا - حق
بات یہ ہے کہ تحقیق اس وقت ترقی کرتی ہے جبکہ کسی چیز کی تقسیم اور تقسیم کی تقسیم کیجاوے
اگر تم ہر ایک چیز پر فوراً بحث شروع کروگے تو بیشک تمکو یہ فائدہ تو ہوگا کہ طرح طرح
کے متعدد مضامین تمہارے لئے موجود ہونگے لیکن تحقیق میں ہرگز ترقی نہ کر سکوگے
اگر تم ترقی چاہتے ہو تو ایک وقت میں حادثات کے ایک حصہ پر فقط اپنے خیال کو جماؤ
یہ مجھکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہسٹری کو اوسکے قدیم طریقہ پر رکھنا چاہیئے اور اون
چیزوں کو جو اس طریقہ سے باہر رہ جاتی تھیں علیحدہ بیان کر دینا چاہیئے - اس لئے میں

سمجھتا ہوں کہ تاریخ کو سٹیٹ سے واسطہ ہے یعنی تاریخ تحقیق کرتی ہے پیدا ہونا اور
تبدیلیاں ایک مخصوص کارپوریٹ سوسائٹی کی جو کام کرتی ہے خاص عاملوں اور
خاص کارکن جماعتوں کے ذریعہ سے۔ نفس سٹیٹ سے لازم آتا ہے کہ ہر شخص جو
ایک ٹیرٹوری میں رہتا ہے وہ اسکی سٹیٹ کا ممبر ہے لیکن تاریخ کو افراد سے سوائے
اس حیثیت کے کہ وہ سٹیٹ کے ممبر ہوتے ہیں اور کوئی بحث یا علاقہ نہیں ہوتا اگر
انگلستان میں کوئی شخص ایک سائنٹفک تحقیق کرے یا کوئی تصویر بنائے تو اسکا
ایسا کرنا تاریخ انگلستان کا کوئی واقعہ نہ ہوگا۔ تاریخ میں افراد اپنی ذاتی خوبیوں
کی کوئی قیمت نہیں رکھتے بلکہ اونکی قیمت اس نسبت سے ہوتی ہے جو نسبت اسٹیٹ سے
علاقہ رکھنے میں اونکو حاصل ہوتی ہے۔ کلیون جو جمہور یونان کا مدبر اور سپہ سالار تھا
حکیم سقراط اس سے بہت بڑا آدمی تہا لیکن یونان کے مورخ نے کلیون کو اپنی کتاب
میں بہت جگہ دی ہے۔ ریورٹ ہارلی سے جو کوئین این ملکہ انگلستان کا وزیر
ہوا تہا حکیم نیوٹن کہیں بڑا آدمی تھا لیکن کوئین این کے عہد کے مورخین نے ہارلی
پر بہ نسبت نیوٹن کے زیادہ توجہ صرف کی۔

ان مطالب کو بیان کرنے کے بعد تم اس سوال کو معلوم کروگے جو میں نے پیدا
کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگلش ہسٹری کا بہاو کس طرف ہے وہ کونسی سمت اور
راستہ ہے جس طرف انگلش ہسٹری جارہی ہے یا جس طرف اوسکو جانا ہے۔ یہ سوال
بادی النظر میں مقررہ و محدود نہ معلوم ہو لیکن فی الحقیقت اسکی حدود بخوبی قایم ہیں
میرے ذہن میں اس عام ترقی کا خیال ہرگز نہیں ہے جو نوع انسان ہر جگہہ
یکساں اور اسلئے انگلستان میں بہی کر رہی ہے اور نہ کسی ایسی ترقی کا خیال
ہے جو انگلستان کے ساتھہ مخصوص ہو۔ انگلستان سے میری مراد صرف سٹیٹ یا
وہ پولیٹیکل کمیونٹی ہے جسکی مجلس ملک انگلستان میں ہے۔ جب مذکورہ بالا
سوال پر اس طرح کی قیدیں لگائی گئی ہیں تو تم کو وہ زیادہ دلچسپ معلوم ہوگا

لیکن کچھ ہو یہ بات یقینی ہے کہ ایسی صورت میں وہ سوال ہماری قدرت اور قابو میں آنے کے قابل بخوبی ہوجاتا ہے +

مورخ کی کیا اغراض ہونی چاہئیں

کارل لئیل کا قول ہے کہ تمام تاریخ ایک بڑے زبان انجیل ہے غیر واضح اور پیچیدہ طریقوں سے وہ الہی صوتوں کو اس دنیا پر منکشف کرتی ہے۔ کسی قوم کی سوانح عمری یا تاریخ تو بکطرف ایک شخص مفرد تک کے حالات زندگی میں خدا کا ایک پیغام پوشیدہ ہوتا ہے جسکے سننے اور نہ سننے والے کانوں کے لئے نازل ہوتا ہے۔ پس حقیقی اور مقصد مورخ کا یہ ہونا چاہئے کہ اس پیغام کو ہر انسان کی تہذیب اور ہر قوم کے تحفظ کے لئے صاف صاف بیان کردے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کام کرے کہ اوس پردہ کو اٹھادے جسکے پیچھے دنیا کے بڑے لوگوں کی شخصیت پوشیدہ ہے اسلئے سچا مورخ نوع انسان کے حق میں سب سے بہت نفع پہنچانے والا ہے۔ تاریخ کو محض واقعہ نگاری سے جو بقید وقت و زمانہ ہو کسی قدر زیادہ ہونا چاہئے۔ مورخ کو فقط واقعہ نویس نہ ہونا چاہئے۔ حقیقی مورخ کا یہ کام اور مقصد ہونا چاہئے کہ وہ ایک قوم کی پوری تاریخ کا جو ایک حصہ وقت میں گذری ہو امتحان کرے۔ اس تاریخ میں کثرت سے واقعات ملینگے جن میں سے بہت سے غیر متعلق ہونگے اور اونکو مورخ کے مقاصد سے کوئی واسطہ نہ ہوگا بجز ایسی حالت کے جبکہ صرف اتفاقی قریب عارضی تطابق سے وہ واقعات متعلقہ نظر آوینگے۔ اس امتحان واقعات کے بعد اسکو ایسے واقعات کو منتخب کرنا چاہئے جو کسی قوم کی زندگی کو اچھی طرح سمجھنے میں ضروری ہوں اور مورخ ان واقعات کو نظر انداز کریگا جو اوسکے مضمون سے کوئی منطقی تعلق نہ رکھتے ہونگے۔ مورخ صرف صاحب فکر، فلسفی اور انشا پرداز ہی نہ ہونا چاہئے بلکہ اوسکو تمیز اور تفریق دکھلانے والا مورخ اور آئندہ کا حال بتلانے والا بھی ہونا لازم ہے سچے طور پر کسی قوم کی تاریخ لکھنے میں مورخ کے ذہن میں اس قوم کے زمانہ ماضی کی صحیح تصویر اور اوس سرزمین کا نقشہ ہونا چاہئے جس

اُس قوم کے بڑے لوگ اور سوسائٹی کے حالات ظاہر ہوئے ہیں علم جغرافیہ اور انسان کی مختلف نسلوں کا علم اور مذاہب مختلفہ میں مشترکہ اعتقادات کا علم اور واقعات کو علمی طریق پر مشاہدہ کرنے کی مشق میں مورخ کو ماہر ہونا چاہئے اوس کو فقط اسباب کا مطالعہ کرنا ہی لازم نہیں ہے کہ لشکر کہاں کہاں پہونچے - پارلیمنٹ اور عدالتوں نے کیا کیا بڑے بڑے قومی سرداروں نے قوم کے معاملات میں کہاں تک دخل دیا - بلکہ مورخ کو اُن خاموش اور مخفی اسباب کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ہے جو عوام الناس کے کثیر انبوہ کی زندگی میں عمل کر رہے ہیں - یہ اسباب وہیں جو بسا اوقات زیادہ وقعت اور زیادہ دور پہونچنے والے نتایج رکھتے ہیں بہ نسبت اون باتون کے جو اپنی چمک نمود اور شان میں تصور اور نظر پر جلد اثر کرتی ہیں - ہم کو شوق ہے کہ لوگون کو اونکے بے تکلف لباس میں دیکھیں - اونکے دلی خیالات اور اونکی روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو معلوم کریں کیونکہ کوئی مورخ پبلک کے مذاق پر پوری قدرت نہیں رکھہ سکتا جبتک کہ وہ اس عام مذاق کو پورا نہ کرے اسلئے یہ بھی ایک مقصد مورخ ہونا چاہیے مورخ کو چاہیے کہ سطح کے نیچے دیکھے اور ان اصولوں کو ڈھونڈ کر نکالے جن پر انسان کی ملکی زندگی اور سکے کام قایم ہیں اور اشیاء کے اسباب دریافت کرے خاصکر اُن اخلاقی اصولوں کو معلوم کرے جو انتظام معاملات ملکی میں شامل ہیں اور تمیز کرے ایسی باتون میں جو فضول ہیں اور جو حقیقی تعلق ترقی واقعات سے رکھتی ہیں - مورخ کو چاہیے کہ فوراً کسی قوم یا شخص یا زمانہ محدود کی خصوصیت اور خصلت کو پہچان لے اور اس قابل ہو کہ صحت کے ساتھہ جھوٹی اور اصلی بزرگی کو جو قوم کے رہنماؤن میں ہون تمیز کرے - اور فرق سمجھہ لے اُن باتون اور قدرتی قوتوں میں جو کسی قوم میں پیدا ہیں اور جو زمانہ کے موجودہ بڑے لوگوں میں ظاہر ہوئی ہیں اور اس ظاہرا بزرگی میں جو کسی شخص پر اتفاق سے ڈال دی جاتی ہے جیسا کہ شاعر نے سچ کہا ہے "بعض پیدا ہوتے ہیں بڑے بعض بڑائی حاصل کرتے ہیں بعض پر بڑائی ڈال دیجاتی ہے" Shakespeare

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جس طور سے سورج کو دھوپ سے اور چاند کو چاندنی سے اور اصل کو فرع سے جدا نہیں کر سکتے اسی طرح عرب کو کسی سلطنت اسلامیہ سے علیحدہ نہیں کر سکتے جب عرب اسلام کا مبدا ہے اور اوس کے عروج اور اقبال کا ماخذ ہے تو ہر سلطنت اسلامیہ کی ابتدا اُسی سے ہوگی یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ہند کی تاریخ سلطنت اسلامیہ تحریر کریں اور عرب کو اسکی بسم اللہ نہ بنائیں اول دو باب عرب کے حال میں لکھے ہیں پہلے باب میں زمانہ جاہلیت یعنی قبل از اسلام کا حال لکھا ہے۔ دوسرے باب میں یہ لکھا ہے کہ اہل عرب کی کل سلطنت دنیا کے کن کن ملکوں میں قائم ہوئی اور پھر اوس کے حصے کس طرح منقسم ہوئے اور وہ عرب کی حکومت سے آزاد ہو کر خود مختار ہوئے اور ان میں خلفاء اور سلاطین کے کن کن خاندانوں نے سلطنت کی اور انکی شاخیں کہاں کہاں پھیلیں جس طرح اس تمہید میں سلطنت اسلامیہ کی بہار کو دکھلایا ہے اسی طرح خاتمہ میں اوس کی خزاں کی سیر دکھائی ہے کہ اس زمانہ میں اسلامی سلطنتوں کا زوال کیسا آگیا ہے اور آئندہ آتا جاتا ہے اور اب مسلمانوں کی کہاں کہاں فرمانروائی ہے اور کیا اونکا حال ہے اور وہ کن کشمکشوں و مخمصوں میں مبتلا ہے۔ یہ تمہید و خاتمہ نہایت مختصر و مجمل لکھے ہیں مگر ہند کی سلطنت اسلامیہ کا حال از ابتدا تا انتہا بہت مفصل لکھا ہے۔

باب اول

زمانہ جاہلیت یعنی قبل از اسلام حال عرب کا

(قبل از اسلام اہل عرب خدا اور رسول و شریعت سے جاہل تھے اسلیے قبل از اسلام اہل عرب پر جو زمانہ گذرا ہے اسکو زمانہ جاہلیت کہتے ہیں) ہندوستان سے ملک عرب وسعت میں کچھ تھوڑا ہی کم ہوگا۔ اوس کی

شکل بھی ہندوستان کے ملتی جلتی ہے اسکو بھی مثلث نما بتلاتے ہیں اور اسکا ایک اوپر قاعدہ باب المندب ٹھیراتے ہیں مگر حقیقت میں نہ ہندوستان کی نہ عرب کی صورت مثلث نما ہے۔ ہمارا ہندوستان تو ایسی ہیکل کی شکل کا ہے جھکا سر کئے ہوا اور بیٹا کچھی سے بائیں طرف جھک کر ملا ہوا ہے۔ اور عرب ایک بے قاعدہ متوازی الاضلاع کی شکل کا ہے۔ ایران کی طرف جو اسکا عمان کا حصہ ہے اسے دور کردو تو باقی حصہ خاصہ مستطیل بنجاتا ہے +

عرب ایک جزیرہ نما ہے یعنی جسکے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی۔ مشرق میں اسکے خلیج فارس اور بحر عمان جنوب میں بحر عرب۔ مغرب میں بحر قلزم یا بحر احمر شمال میں ملک شام۔ اسکو یہ ملک گھیرے ہوئے ہیں۔ ایران۔ سریا۔ (شام) مصر۔ ابتھی اوپیا (حبش) ۱۲° ۴۰' اور ۳۴° شمالی عرض بلد اور ۳۲° ۳۰' و ۶۰° شرقی طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ اسکے رقبہ کا تخمینہ ۱۲۱۹۷۴۰ مربع میل کیا گیا ہے عرض سے طول دگنا ہے زیادہ ہے زیادہ طول پندرہ سو میل ہے معلوم نہیں جھوٹ یا سچ ایک کروڑ آدمیوں کی آبادی اس میں بتائی ہے۔ اس جزیرہ نما عرب کو جزیرۃ العرب بھی کہتے ہیں +

عرب کی وجہ تسمیہ میں بہت کچھ محققین نے خامہ فرسائی کی ہے مگر کوئی امر متحقق نہیں ہوا عربا کے معنی عبرانی زبان میں ہموار بیابان کے ہیں۔ لغت عرب میں عرب ایک خاص قوم کا نام ہے جو عجم نہ ہو۔ عرابہ کے معنی گندم گوں کے ہیں۔ غرض ایسی ہی خوبیاں کر کے عرب کی وجہ تسمیہ بیان کیجاتی ہیں +

اس ملک میں بیابانوں وریگستانوں وکوہستانوں کی عجب بہار ہے۔ تاتار کے بیابانوں میں تو کہیں کہیں دست قدرت نے بلند بلند درخت اور سبز جھاڑی بوٹی لگا دی ہے جب انمیں تنہا مسافر منزل پیما ہوتا ہے تو ان نباتات کے ملنے کو بہت غنیمت جانتا ہے اور وہ ان سے متمتع ہوتا ہے۔ مگر ملک عرب کے بیابان تو وہ ہموار ریگستان میدان ہیں کہ جس میں پہاڑ ننگے کھڑے ہیں اور ان پہاڑوں پر بھی کہیں سبزہ زار نہیں پھر اس صحرا میں جہیں درختوں کا سایہ ہے نہ کوئی اور پناہ کی جگہ ہے آفتاب کی شعاعیں سیدھی اور تیز پڑتی ہیں جو خط استوا کے اقالیم میں پڑا کرتی ہیں بھلا ایسے مقام میں نسیم کا نشان کہاں۔ اسکی جگہ پچھم و دکن کی طرف سے باد صرصر کے طوفان آتے ہیں مہلک بخارات اپنے ہمراہ لاتے ہیں ریگستانوں کو نچلا بیٹھنے نہیں دیتے ان میں سمندر کا سا تلاطم مچاتے ہیں ریگ کے تودے کے تودے ادھر سے ادھر ایسے لہراتے ہیں کہ جیسے بحر میں طوفان کے اندر پانی کی لہریں لہراتی ہیں ان کے اندر گھو لو نمبر

عرب کی زمین اور آب و ہوا

قافلے کے قافلے غائب ہوجاتے ہیں فوجیں کی فوجیں دب کر دفن ہوجاتی ہیں پانی وہاں ایسا نایاب
کہ جسکے لئے انسان بیتاب رہتا ہے جب ملجاتا ہے تو اُسکے پینے پلانے اور فائدہ اٹھانے پر ایک فساد
برپا ہوجاتا ہے۔ پانی کے ساتھ آگ کی بھی قلت ہے۔ لکڑی کا کال رہتا ہے آگ کا سلگانا اور اسکو
دیر تک قائم رکھنا بڑے ہنر اور سلیقہ کا کام گنا جاتا ہے عرب کی سرزمین ایسے دریاؤں سے خالی ہے
کہ جسمیں جہاز رانی ہوسکے اور وہ زمین کو سرسبز و شاداب کریں اور قرب و جوار کے ملکوں کے اندر
ملک کی پیداوار کو لیجانے کے لئے وہ راہیں بنائی جائیں زمین وہاں کی ہمیشہ تپتی رہتی ہے۔ اسلئے
ایسی پیاسی رہتی ہے کہ جو پہاڑوں سے سیل اور رو میں پانی کی بہہ کر آتی ہیں انکو نوش جان کر کے ایسے
ہضم کر جاتی ہے کہ ڈکار بھی نہیں لیتی۔ کھجور کے جھنڈ اور ببولوں کے درخت نہایت سخت پہاڑوں کی
چٹانوں میں اپنی جڑیں جماتے ہیں رات کی اوس انکو پال پوس کر بڑا کرتی ہے۔ مینھ گاہ گاہے برستا ہے
تو مینھ کا پانی حوضوں اور نالیوں میں بھر لیا جاتا ہے۔ ریگستان میں کنوں اور چشموں کا پانا گویا جنگل میں ایک
مخفی گنج دولت کا پانا سمجھا جاتا تھا۔ حاجی جو مکہ کو حج کرنے جاتے تھے انکو بڑی کڑی منزلیں خشک و گرم میدانوں
میں طے کرنی پڑتی تھیں جب انکو شور زمین کا آب وان تلخ و بے مزہ پینا پڑتا تھا تو اُن کی طبیعت کو نہایت
ناگوار ہوتا تھا۔ قاہرہ سے مکہ تک پندرہ منزلیں ہوتی تھیں جنمیں گیارہ منزلوں میں پانی نہیں ملتا تھا۔
غرض ملک عرب کے اکثر حصوں کی آب و ہوا کا یہ حال تھا گو بعض مقامات ان میں مستثنے بھی تھے۔
قاعدہ ہے کہ جہاں محنت مشقت تکلیف مصیبت کی کثرت ہوتی ہے وہاں تھوڑے سے آرام کی بھی نہایت
قدر ہوتی ہے اور جہاں کچھہ بھی آرام ملتا ہے وہ بہت آرام سمجھا جاتا ہے جب ملک عرب کا یہ حال تھا کہ
اسکی آب و ہوا روح پرور کمتر اور صرصر کا طوفان سر پر اکثر۔ اُدھر ہوا آتش فشاں ہوتی تھی اِدھر پانی اپنا پتا
نہ بتاتا تھا۔ لکڑیاں جلانے کے لیے سوکھا جواب دیتی تھیں آتش آب رنگ (سراب) جان لینے کے لئے بلاتے تھی
کانٹے و ٹیلے چلنے کو سد راہ ہوتے تھے۔ سبز کھیتی اور سایہ دار درخت شاذ و نادر ہوتے تھے۔ جہاں یہ تکلیفوں پر
تکلیفیں ہوں وہاں کے باشندے ایسے مقامات کی قدر حد سے زیادہ کیوں نہ کریں اور وہاں سکونت کیوں نہ اختیار
کریں جہاں سایہ دار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہوں چراگاہ و سبزہ موجود ہوں۔ برسات کا پانی یا کوئی چشمہ
وہاں رواں ہو۔ پس اہل عرب ایسی مقامات کی تلاش میں رہتے تھے جہاں وہ ان کو مل گئے وہاں اُترنے

قبیلے کے قبیلے چلے جاتے تھے۔ اپنے اپنے بکریوں کے گلے اور اونٹوں اور گھوڑوں کو ساتھ لے آتے
تھے اور اُن کو چرا کر تازہ دم و توانا کرتے تھے اور خرما اور انگور کی زراعت سے اپنی محنت کا ثمرہ پاتے تھے
ملک عرب میں جو سرزمین مرتفع بحر ہند کے ساحل پر واقع ہے وہ سارے ملک میں ممتاز و سرفراز اس بات میں
تھی کہ وہاں پانی اور لکڑی کی افراط تھی۔ ہوا میں اعتدال رہتا تھا میوے بڑے بامزہ ہوتے تھے
حیوانوں اور انسانوں کی وہاں کثرت تھی۔ زمین کی شادابی اور زرخیزی کاشتکار کو پکار پکار کے
بلاتی تھی کہ یہاں آؤ اور مجھ میں زراعت کرکے اپنی ریاضت کا ثمرہ پاؤ اور اوسکا مزہ اُٹھاؤ۔ یہاں
زراعت کا سامان یہ تھا تجارت کی صورت یہ تھی کہ قہوہ نافع اور لوبان معطرہ ساری دنیا کے
تاجروں کو ہر زمانہ میں اپنی طرف رغبت دلاتا رہا ہے۔ تاجر ہمیشہ اس کی طرف بطیب خاطر التفات کرتے
رہے ہیں ساری عبادت گاہوں کو لوبان معطر کرتا تھا پھر ایسی عمدہ چیز پر کیوں نہ تاجر دوڑتے
آئیں۔ یہاں کے مصالحوں کا خوشبودار ہونا ضرب المثل کے طور پر دور دور مشہور تھا۔ کتب مقدسہ
میں ان کا ذکر بہت آتا ہے شعروں میں اُن کی تشبیہات موجود ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ
اِن خوشبوؤں سے ممند (مسرور) ہو کر اپنی موج کے کوسوں تک تبسم کرتے ہیں ملک عرب میں یہ خطہ
اسکے تمام اور حصوں سے ایسا جدا ہے کہ اگر ہم اسکو فردوس عرب کہیں تو بجا ہے۔ شاعروں نے تو
اپنے خیالات اور تصورات کی رنگ آمیزی سے اس کو فردوس بنا کر کہہ دیا کہ + اگر فردوس بر روئے
زمین است + ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست + اس خطہ کو خدا تعالیٰ نے عجب عجب نعمتیں
اور اپنے بد قدرت سے عجب عجب صنعت کے کام ایسے کیے ہیں عیش و عشرت و عصمت ایسے
راگ ہیں کہ جنکے سر کبھی نہیں ملتے مگر یہاں انکو ملا دیا ہے۔ زمین کا پیٹ زر و جواہر سے بھر دیا
بحر و بر کی ہوا سے عطر یہاں سے ایسی اُٹھائی کہ قوت شامہ کو عطر آگیں کرتی تھی +

یونانیوں اور رومیوں کو خوب معلوم تھا کہ ملک عرب کا ایک حصہ سنگلاخ و کوہستان ہے
دوسرا بیابان و ریگستان تیسرا حصہ سرسبز و شاداب۔ انھوں نے اسی طرح ملک عرب کی تقسیم
تین حصوں میں کر دی بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں عرب کے یہ تین حصے کیے عرب الحجر عرب البوادی
عرب المعمور مگر اس تقسیم کو اہل عرب نہیں مانتے وہ صحیح بھی نہیں ہے۔ اہل عرب نے اپنے ملک کی

یہ تقسیم و تحدید خود نہیں کی تعجب ہے کہ جس ملک کے باشندوں کی زبان ایک ہو اور وہ خود بھی ایک ہوں وہ اپنی سرزمین کی تقسیم قدیم کی نشانیاں اور علامتیں فراہمی نہ مقرر کریں عربی جغرافیوں میں ملک عرب کی تقسیم ان پانچ حصوں میں لکھی ہے۔ تہامہ۔ حجاز۔ نجد۔ عروض۔ یمن۔ یمن کا نام یورپ کے ملکوں میں عربیا فیلکس رکھا گیا ہے +

کیخسرو کے زمانہ میں عرب کی ماند و بود کی یہ کیفیت تھی کہ خلیج فارس اور بحر ہند اور بحر قلزم کے کناروں پر وہ مچھلی کا شکار کرکے اپنے پیٹ کو پالتے تھے۔ مچھلیوں کے آسرے پر جیتے تھے۔ ساحل بحر اِس شکار کی تلاش میں خوار پھرتے تھے شکار کا ہاتھ آنا کچھ شکاری کے اختیار میں تو ہوتا نہیں کبھی اتنا ہاتھ آگیا کہ پیٹ بھر گیا اور بچ رہا کبھی اتنا بھی نہ ہاتھ آتا کہ پورا پڑتا۔ یہ ابتدائی ماہی خوری کی حالت ایسی ذلیل و خوار تھی کہ اس کو تمدن انسانی کہنا ننگ نوع بشر ہے ان وحشی انسانوں میں گو مردم خوری نہ تھی مگر نہ انکو کوئی فن آتا تھا نہ کوئی قانون و آئین جاری تھا۔ عقل و زبان کے پیرایہ سے بھی معرا تھے انکی اور بہائم کی حالت ایسی یکساں تھی کہ انمیں تمیز کرنا بھی دشوار تھا معلوم نہیں کہ ان مچھلیوں کے ہیڈ نے انکو ساحل بحر تنگ قیدخانہ میں کب تک قید رکھا اور انکو ایسا اپنے عروج و بار رکھا کہ نہ ابھرنے کی اجازت دی۔ آگے ظہور کی اتنی قرن انکے ان بہائم صفتی میں گزر گئے جسکو اب زمانہ یاد نہیں رکھتا۔ بیابان بھی ان وحشیوں کے پاس ایسے نہ تھے کہ ان کے شکار سے مدت تک گذارہ ہو سکتا اسلئے کہ قاعدہ ہے کہ بیابان میں جب ہی تک شکار رہو گا گذارہ ہو سکتا ہے کہ پیٹ بھر کر شکار انہیں ملے پس جب ان بیابانوں میں بھی انکا گزارہ مشکل ہوا تو بہت زمانہ اس پر گزر چکا ہے کہ انھوں نے اپنے تئیں اس پستی سے ابھارا انھوں نے چرواہا ہونے کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ پیشہ ہزار ہا برس اور مانوس ہے۔ سارے ریگستانی بیابانوں کے اقوام خانہ بدوش اسی پیشے سے اپنی بسر اوقات کرتی تھیں زمانہ حال میں بدوؤں کی صورت و بشرہ ان بزرگوں کے پیشہ شبانی کی شہادت دیتا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ و آنحضرت علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک ہی طرح رہتے تھے۔ وہی انکے چمڑے کے خیمے بدوؤں کے خرگاہ میں رہنے کے لئے تھے دنبوں اور بکریوں کے گلے اور اونٹ گھوڑے اپنے قبیلے کے ساتھ لئے پھرتے تھے جہاں پانی کا چشمہ اور جانوروں کا چارہ اور اپنا گزارہ دیکھا وہیں ڈیرے ڈالدیئے۔ تنبو تان لئے۔ آسمان کے

گلے بسیرا لینے لگے +

قاعدہ ہے کہ جب چرندہ اور بکار آمد جانور انسان کے قابو اور بس میں آ جاتے ہیں تو وہ انسان کی محنت کرنے اور دولت بڑہانے میں وہ بڑے مدد و معاون ہوتے ہیں پس ان عرب کے چرواہوں کو گھوڑا جو ایک وفادار دوست کا کام دیتا تھا اور اونٹ جو جفاکش غلام کی سی خدمت کرتا تھا ایسے بس میں آ گئے کہ انکی باگ و نکیل کو ہاتھ میں لیکر جہاں چاہیں ان کو لئے پھریں اور جو خدمت چاہیں اُن سے لیں علم حیوانات کے جو عالم ہیں اُن کی یہ رائے ہے کہ گھوڑے نے سب سے پہلے ملک عرب میں جنم لیا ہے اس شریف نجیب جانور کے لئے قدرت نے یہیں کی آب و ہوا کو پیدا کیا تھا گو اس کے قد و قامت کو وہ چنداں بلند نہیں کرتی مگر تیزی و چستی و چالاکی شتابی وہ پیدا کرتی ہے کہ جس کا جواب دنیا میں نہیں +

اسپانیہ انگلستان کے گھوڑوں کی نسل میں جو خوبیاں پیدا ہوئی ہیں وہ ان عربی گھوڑوں ہی کے تناسل کا طفیل ہے شریف و نجیب گھوڑوں کی نسل کا باقی رکھنا بدوؤں کا ایمان ہے اور جیسا کہ انسان اپنی شرافت کو ایسا یاد نہیں رکھتا جیسا کہ بدو ان گھوڑوں کی نسل کی نجابت کو یاد رکھتا ہے وہ نر کو فروخت کر ڈالتا ہے مگر مادہ کو جان کے برابر رکھتا ہے مشکل ہی سے جدا کرتا ہے جب کوئی نجیب گھوڑی بچھیرا دیتی ہے تو اسکی خوشی کی مبارک سلامت آپس میں شادی کی سی ہوتی ہے - بدو اپنے خیموں میں گھوڑوں کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کی طرح کرتے ہیں + اور ان سے محبت بھی اپنی اولاد سے کم نہیں کرتے اسی سبب سے گھوڑوں کو بھی اُنسے موانست کی عادت ہو جاتی ہے - وہ رہوار اور سرپٹ دوڑنے کے مشاق ہوتے ہیں سوار مہمیز اور تازیانہ کو متواتر مارنے سے اُن کے حواس کو کند نہیں کرتا بلکہ ان دو چیزوں کو اس وقت کے لئے اُٹھا رکھتا ہے کہ اس کو خود بھاگنا ہوتا ہے یا کسی کے تعاقب میں جانا ہوتا ہے - ایسے وقتوں میں جب تازیانہ کا ہاتھ لگاتا اور ایڑ مارتا ہے تو گھوڑوں کو باد رفتار بنا دیتا ہے اگر کہیں اسکا سوار پیٹھ سے جدا ہو کر گر جاتا ہے تو وہ اس اپنے دوست کے انتظار میں کھڑا ہو جاتا ہے جب وہ اپنے ہوش حواس ٹھیک کر کے پھر سوار ہوتا ہے تو وہ آگے قدم اُٹھاتا ہے +

عرب اور افریقہ کو خدا نے یہ بڑا شرف دیا ہے کہ اس میں اونٹ کو پیدا کیا ہے - یہ جانور کیا عمدہ

حلیم ہے کیسی گرمی کی شدت تشنگی گرسنگی کا متحمل ہوتا ہے کئی کئی روز تک صرف دانہ و چارہ گرمی گرمی
سنرلیں طے کرتا جاتا ہی ع بیچارہ خارمے خورد و بار مے کشد۔ اس کے پانچویں اوجھ میں ایک بڑا
کیسہ ہوتا ہے وہ تازہ پانی سے بھرا رکھتا ہی۔ اونٹ کے جسم کی ساخت ایسی بنی ہے کہ گویا اسپر
یہ عبارت کندہ ہی کہ اے انسان اپنا خدمت گذار بنا لے وہ اطاعت کے لئے سب طرح حاضر ہے۔
اونچی نسل کا اونٹ ساڑھے بارہ من بوجھ پیٹھ پر لاد کر لیجاتا ہی۔ اور سانڈنی سبک اندام اور چالاک
دوڑ سے کے تیز گھوڑوں سے آگے نکل جاتی ہی۔ اونٹ اگر ان ملکوں میں نہ ہوتا تو وہاں کے باشندوں
کا رشتہ معیشت ہی ٹوٹ جاتا۔ کاروانوں کا سلسلہ ہی منقطع ہوجاتا۔ دودھ اس کا بکثرت ہوتا ہے
اور مقوی بھی ہوتا۔ دہی اہل عرب کی سب سے زیادہ عمدہ غذا تھی۔ اسکے بچے کا ملائم گوشت گائے کے
بچھڑے کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہی۔ پیشاب اس کا بیش بہا نمک کی کان ہوتا ہی مینگنیاں اسکی
جلانے کے کام میں آتی ہیں لمبی پشم اسکی ہر سال گرتی ہی اور از سر نو جمتی ہے اسکو عورتیں تو م کر اور
کات کر اور بنکر لباس اور خیمے اور اسباب گھر کے بناتی ہیں۔ غرض اس پشم کو عربوں کے خانمان آباد
کرنے میں بڑا دخل ہے۔ اگر مینہ کے برسنے سے کہیں کہیں جنگل میں نباتات کا نمو ہوجاتا تھا تو ان کو
بدو کھلاتے تھے موسم گرما کی شدت حرارت اور موسم سرما کی قلت حرارت میں ساحل بحر پر یا یمین کے
پہاڑوں میں یا دریائے فرات کے قرب و جوار میں وہ اپنے خیموں کو لیجاتے تھے۔ اکثر وہ رود نیل کے
کنارہ پر اور شام اور فلسطین کے مواضع میں بڑے بڑے خطرے اٹھا کر وہاں رہنے کی اجازت بالجبر
حاصل کرتے تھے۔ ایک خانہ بدوش بدو کو بعض اوقات غارتگری یا تجارت سے اپنی محنت کا ثمرہ ملجاتا تھا
مگر پھر بھی اس طرح زندگی بسر کرنا سخت جفاکشی کا خطرناک کام تھا۔ بدوں کا وہ امیر سکبر جو دس ہزار
سوار میدان جنگ میں لیجا سکتا تھا وہ عیش و آرام نہیں پاتا تھا جو ادنیٰ امیر فرنگستان کا پاتا ہی +

عرب کے شہر اور اُنکی تجارت و زراعت

عرب کے قبائل کیا تو خانہ بدوش پڑے پھرتے تھے یا بہت سے مجتمع ہو کر قصبات اور دیہات آباد
کرتے تھے اور تجارت و فلاحت کے کاموں کو کرتے تھے۔ مویشی کی پرورش میں سخت محنت اٹھاتے
تھے اور اپنے وقت کا ایک حصہ اُنہیں صرف کرتے تھے صلح و جنگ کے وقت وہ انہی ریگستانی بھائیوں
کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے یوں بدوؤں میں آپس میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا بیوپار

لین دین ہمسایہ کے قوموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان سے بعض حاجتیں بھی روا ہو جاتی تھیں علوم و فنون کی الف بے تے کا بھی کوئی سبق پڑھ لیتے تھے۔ ابو الفدا نے عرب میں بیالیس شہر شمار کئے تھے۔ اکثر نہایت قدیمی اور آباد ملک سمنت اندرونِ یمن میں واقع تھے +

شہر صنعا کے برج عالی شان اور مآرب کے حوض تعجب خیز اور حیرت افزا حمیر کے بادشاہوں نے بنائے تھے۔ جو صنائع معماری سے آراستہ تھے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ نے ان دونو شہروں کے زیب و زینت کے آفتاب کو کسوف لگا دیا۔ یہ کیوں نہ ہوتا وہ بادشاہوں کے بنائے ہوئے یہ نبیوں کے بنائے ہوئے تھے کہاں بادشاہ کہاں نبی چہ نسبت خاک را با عالم پاک + مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں (۲۰۰) میل کا فاصلہ ہے اور دونو شہر بحر قلزم کے نزدیک ہیں۔ ان مقدس شہروں میں سے یونانیوں نے مکہ کا نام الیبار رکھا تھا جس کے معنی اس شہر کی عظمت و شوکت کو ظاہر کرتے تھے۔ یہ شہر اپنے معراج کے زمانہ میں بھی مارسلیز پر فائق نہیں تھا۔ یہ شہر ایسی جگہ آباد ہے جہاں کوئی توقع سود اور بہبود کی نہیں ہو سکتی۔ بانیان شہر نے کوئی مبارک شگون سوچ کر اور اپنی مصلحت سمجھ کر اس کی بنیاد رکھی ہوگی اس میں مٹی اور پتھر کے مکانات دو میل طویل اور ایک میل چوڑی جگہ میں بنے ہوئے تھے۔ یہ جگہ ایسی دامن کوہ میں واقع تھی کہ جس پر نباتات نے اُگنے کی قسم کھائی تھی۔ زمین پتھریلی۔ پانی کھاری یہاں تک کہ آبِ متبرکہ چاہ زمزم بھی شیریں سے خالی تھا۔ سبزہ چراگاہ شہر سے دور فاصلہ پر طائف یہاں سے ستر میل کے فاصلہ پر تھا جہاں کے انگور یہاں بکنے آتے تھے۔ اس شہر کی حکمراں قوم قریش تھی جو اور قوموں میں ممتاز اور نامور تھی۔ کل عرب میں اسکی شجاعت کی دھوم تھی۔ قوم قریش کے پاس یہاں کی زمین ایسی بے فیض تھی کہ خواہ اُس کے بونے جوتنے میں کوئی جان ہی کیوں نہ کھپا دے لیکن وہ ایک دانہ بھی اُسکو نہ دیوے مگر ہاں اپنے اقامت گزینوں کو تجارت سے فائدہ پہنچاتی تھی +

جدہ کا بندرگاہ اس سے چالیس میل پر تھا۔ اس کے توسط سے ملک حبش کے ساتھ سلسلہ آمد و رفت بآسانی جاری تھا۔ افریقہ کا مال عرب میں ہو کر حیرہ کیف جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کتف و ضلع بحرین میں خالدیہ کے جلائے وطنوں نے نمک کی کتل سے بنایا تھا۔ پھر یہاں سے قریش خلیج فارس کے موتیوں کو لیکر بیڑوں میں سفر کر کے دریائے فرات کے دہانہ تک لیجاتے۔ کہ یمن اور

شام کے وسط میں واقع تھا۔ ہر ایک ایک مہینے کے سفر کا فاصلہ رکھتا تھا۔ ملک یمن اس کے جانب جنوب میں اور
اور ملک شام اس کے جانب شمال میں واقع تھا۔ اس کے کاروان گرمیوں میں ملک یمن میں اور جاڑوں
میں ملک شام میں قیام کرتے تھے۔ ان موسموں میں عین وقت پر کاروانوں کے پہنچنے سے ہندوستان
کے جہازات کو طول طویل اور خطرناک سفر بحر قلزم کا طے کرنا پڑتا تھا۔ صنعا اور مارب کے بازاروں
میں اور عدن اور عمان کے بندرگاہوں میں قیمتی اور خوشبودار مصالحے کی کھیپیں قریش لاد کر
لاتے تھے اور بصرہ اور دمشق کے میلوں میں سے اناج اور صنعت کاری کی چیزیں خرید کے لیجاتے
غرض اس مفید تجارت کی بدولت مکے کے کوچہ و بازار مال و متاع سے معمور رہتے تھے۔
وہاں کے امرا اور شرفا کو جیسے کہ سپہ گری کے پیشے سے موانست تھی ایسے ہی تجارت سے بھی الفت تھی

یہ اور بھی منجملہ عجائبات روزگار ہے کہ اہل عرب ہمیشہ آزاد رہے۔ کوئی غیر قوم ان پر فرمانروا
نہیں ہوئی۔ اس بات پر ان کو خود بھی بڑا ناز اور افتخار تھا۔ اور غیر قومیں ان کی اس بات
کی مدح خواں ہیں +

اب اس آزاد رہنے کے سبب ارباب الرائے مختلف بتاتے ہیں بعض عیسائی عالم اس کو کتاب
پیدائش کے ۱۶ باب کے ۱۱ و ۱۲ آیت کی پیشین گوئی سے منسوب کرتے ہیں اور اس سے اپنے مذہب کی صداقت
دکھلاتے ہیں آیتیں یہ ہیں کہ (خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی
اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند کریم نے تیرا دکھ سن لیا وہ وحشی آدمی ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے اور
سب کے ہاتھ اسکے برخلاف ہونگے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کریگا) اول تو
اس آیت کے معنی بہت سے ہو سکتے ہیں دوسرے وہ آزادی عرب کی مصداق اس سبب سے بھی نہیں
ہو سکتی کہ سلطنت یمن بھی اہل حبش اور اہل فارس اور سلاطین مصر کے حملوں کی لگدکوب میں رہی
مکہ و مدینہ کے متبرک شہروں نے جبابرہ سدید (تاتاری ظالم) کی اطاعت میں سر جھکایا اور رومیوں
کی سلطنت کا تو عرب ایک صوبہ تھا جسمیں وہ خاص ویرانہ شامل تھا جس میں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
اور ان کی نسل نے اپنے بھائیوں کو دخل کیا ہے + غرض یہ طریقہ استدلال جیسا
نامعقول ہے ویسا ہی فضول۔ تم اس کو خوب یاد رکھو کہ یہ اوپر جو بیشتر صورتیں بیان ہوئی ہیں وہ

چند روزہ حاکم نہیں تھیں یا کسی خاص معاہدے سے مخصوص نہیں رہنا عرب کی کل قوموں نے بڑے بڑے
صاحب جلال اور شان و شکوہ بادشاہوں کے غاشیہ اطاعت کو اپنے کندھے کے اوپر نہیں رکھا
نہ کندھا کسی کے جوئے کے نیچے دھرا ہزاروں برس آزاد رہے فراعنہ مصر اور شاہان شام کی سعی
اس کی فتح میں بے حاصل ہی کیخسرو ایرانی اور اسکندر یونانی سے بجارہ روم کی سلطنت کا علم
ساری دنیا میں بلند ہوا مگر یہ سرزمین محفوظ رہی طارس پومپی۔ ٹریجن وغیرہ کی فوجیں برسوں
بیٹھی رہیں مگر ملک عرب کو زیر نہ کر سکیں گو حال میں سلطان روم ان پر حکومت برائے نام رکھتا
اپنے انتظام کا سایہ وہاں ڈالتا ہے مگر ان کو چھیڑنے سے ڈرتا ہے۔ ان پر حملہ آوری بے سود
جانتا ہے۔ مگر افسوس دوستی کی التجا کرتے ہوئے بھی اس کی شان میں جفنہ آتا ہے خدا نے یہ
ملک ہی ایسا بنایا ہے اور اُس کے باشندوں کے خصائل و طرز روش کو ایسا رکھا ہے کہ وہ ان کی
آزادی کی بڑی معاون ہیں آنحضرتؐ کے عہد سے قرنوں پہلے ان کی بیباکانہ جرأت و ہمت اور
شجاعت کو ہمسایہ کی قوموں نے خوب آزما لیا تھا کبھی وہ ان پر چڑھ کر آئے کبھی یہ ان پر چڑھ کر گئے۔
دونوں نے لڑائیوں میں اپنی قوتوں اور زوروں کو تول لیا تھا۔ انکا پیشہ چرواہے ہونے کا ایسا
تھا کہ اس میں خود بخود نادانستہ سپاہیانہ چستی و چالاکی سختی کی برداشت کرنی جفاکشی عادت
میں داخل ہو جاتی تھیں بھیڑوں کے گلوں کی اور اونٹوں کے قطاروں کی نگہبانی اپنی جورو توں کے
سپرد کرتے تھے اور جو مردان کار ہوتے تھے وہ اپنے کسی امیر کے علم کے نیچے گھوڑوں پر سوار ہو کر
میدان کارزار میں تیر چلانے کو برچھی اور تلوار مارنے کو تیار رہتے تھے انکو اپنی قدیمی آزادی
ایسی دل پسند تھی کہ وہ اسکا وظیفہ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یاد کرایا کرتے تھے۔
یہ دونوں باتیں اُن کی آزادی مدام کی کفیل تھیں اُن کی اولاد خوب سمجھے ہوئی تھی کہ ہماری اصالت
اور نجابت کا ثبوت یہی ہے کہ ہم آزادی کو جو باپ دادا سے ارث میں پہونچی ہی قائم و ثابت رکھیں
وہ اس لیے اپنی آزادی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے جب کوئی غیر دشمن ان پر حملہ آور
ہوتا تھا تو وہ اپنے سارے باہمی جھگڑے و فساد تہ کر کے رکھ چھوڑتے تھے اور سب متفق ہو کر
دشمن کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑتے تھے +

جب ان کی ترکوں سے آخر معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں تو اس میں مکہ کے ایک کاروان کو تیمی اور
اقوام ترک نے حملہ کر کے غارت و تباہ کیا تھا جب اہل عرب دشمنوں سے جنگ کے لئے آگے قدم بڑھاتے
تھے تو فتح و ظفر اُن کے آگے اور پیچھے بھی دست بستہ کھڑی ہوتی تھی جب دشمنوں کے آگے
سے پیچھے ہٹتے تھے تو اُس کے ہاتھ سے سلامت جانے کا یقین ساتھ ہوتا تھا۔ اِن کے تعاقب
میں ظفرمند دشمن کی سعی کچھ کام نہ کرتی تھی۔ اِن کی رانوں تلے وہ خوش عنان تیز رفتار
گھوڑے اور اونٹ ہوتے تھے کہ آٹھ دس روز میں چار پانچ سو میل اُن کو ایسا اُڑا کر لے جاتے تھے
اور ان کو ریگ سوزاں کے گوشوں میں اُتار دیتے تھے کہ دشمن ان کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا
اگر وہ ان کے پیچھے جاتا تو اِدھر ان کے پتا لگانے میں حیران رہتا اُدھر پانی کی تلاش میں پیاسا
مرتا۔ کھانے کو خاک نہ ملتا۔ یہ بھوک پیاس پھر اس پر سفر کی درماندگی اُن کو موت کا لقمہ بنا تی
اور انکو آزاد کا آزاد رہنے دیتی۔ یہ بدوں کے ہتیار اور ان کے ریگستان صرف انھیں کی آزادی
کے پشت و پناہ نہ تھے بلکہ عرب شاداب یعنی ملک یمن کے دشمنوں کے لئے بھی سد راہ تھے جہاں کے
باشندے زمین کی رطوبت اور آب و ہوا کے باعث کمزور ہو جاتے تھے اور جنگ و پیکار سے بھاگتا
رہتے تھے۔ اغسطوس قیصر روم نے جب یمن پر حملہ کیا تو اس کی فوج بڑی بیماری اور درماندگی
سے تباہ ہو گئی۔ صرف فوج بحری کی امداد سے اُسے فتح کیا۔ جب آنحضرتؐ کا علم متبرک یہاں
قائم ہوا تو ملک یمن سلطنت فارس کا ایک صوبہ تھا۔ مگر پھر بھی حمیر کے خاندان کے سات
شخص پہاڑوں میں حکمرانی کرتے تھے۔ کسریٰ نے جو حاکم اپنی طرف سے یہاں خسرو کو کر کے بھیجا
تھا وہ اپنے ملک بعید کو اور بدنصیب آقا کو بھول گیا تھا *

جنتی نی ان بادشاہ روم کے عہد کے مورخوں نے ان خود مختار آزاد عربوں کے حال کو
بخوبی مفصل بیان کیا ہے کہ وہ شرقی معرکہ آرائیوں میں کہ نہایت عرصہ دراز تک قائم رہیں
کسی اپنی مصلحت سے یا خود غرضی سے یا میلان طبع سے کبھی فریق ہو کر لڑنے والوں کے ساتھ شریک
درفیق ہو گئے تھے۔ بنی غسان کو اجازت ہو گئی تھی کہ وہ ملک شام میں خیمہ زن ہوں۔ حیرہ
کے شاہزادوں کو حکم تھا کہ وہ بابل کے ویران شدہ کھنڈروں کے جنوبی جانب میں

چالیس سپل پر ایک شہر بالیس یہ عرب میدان جنگ میں نہایت تیزی و چالاکی و دلیری و دلاوری سے کام دیتے تھے۔ مگر اپنی دوستی نیلام کرتے تھے جنے زیادہ قیمت دی اسی کے یار و مددگار رہے ان کی وفاداری کا کچھ سر پاؤں نہ تھا۔ عداوت میں تلون تھا۔ ان خانہ بدوش قوموں کو چھیڑ کر بھڑکا دینا بہت آسان تھا۔ مگر ان سے ہتیار لینا بہت دشوار تھا۔ روزمرہ کی لڑائیوں سے وہ فارسیوں اور رومیوں کو کمزور جانتے اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

سارسین کا خطاب

یونانی اور رومی ان اقوام عرب کو جو مکہ سے دریائے فرات تک آباد ہیں خلط ملط کر کے سارسین کا خطاب دیتے تھے۔ یہ وہ مسلمانوں کا نام ہے کہ کسی زمانہ میں عیسائیوں کے منہ سے نہ نکلتا تھا کہ ان کے دل میں ہول نہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور عداوت و نفرت طبیعت میں پیدا ہوتی تھی +

اب اس نام کی وجہ محققین نے مختلف طور پر بیان کی ہے۔ کوئی تو تمسخر کی راہ سے یہ بتاتا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارہ سے مشتق ہے۔ بعض اس کو سارقیہ سے جو ایک گاؤں کا نام ہے مشتق بتلاتے ہیں بعض سارق سے مشتق کہتے ہیں بعض شرق سے اس آخر اشتقاق میں خوبی اوروں کی نسبت کچھ ہے۔ ان سب کی تردید یوں ہوتی ہے کہ یہ خطاب جو اہل عرب کو دیا ہے وہ غیر قوموں نے دیا ہے جو عربی زبان سے محض نا آشنا تھیں پھر وجہ تسمیہ میں عربیت کو کیسے دخل ہو سکتا ہے۔ کوئی غیر قوم جو خطاب دیگی تو اپنی زبان میں نہ اپنے سے غیر زبان میں +

اہل عرب کی آزادی اور ریاست اور ان کی خاص خاص عادات

اگر ایک قوم کسی غیر قوم کی محکوم نہ ہو اور خود فرمانروا ہو مگر اس کو اپنے بھائیوں اور قوم کے ہاتھ سے جور و ستم اٹھانے پڑیں اور اپنے ہی بادشاہوں و افسروں کے جور و جفا سہنے پڑیں تو اس کو اپنی آزادی پر ناز کرنا نازیبا و نامناسب ہے۔ وہ حقیقت میں آزاد نہیں ہے مگر اہل عرب اس قسم کے آزاد نہ تھے۔ بلکہ ہر فرد انکے خود سر و آزاد تھی ہر عرب تمدن و اجتماع کے فائدوں سے کسی قدر بہرہ مند ہوتا تھا۔ اور جو طبیعت بشر میں قدرتی استحقاق آزادی کے رکھے گئے ہیں۔ انکو وہ کبھی اپنے ہاتھ سے نہ دیتا تھا جو خاندان اپنی قوم پر احسان کرتا یا دولتمند ہو جاتا۔ یا دین و مذہب کا حامی ہو جاتا۔ وہ اپنی ہمسروں میں ممتاز و سرافراز ہوتا تھا۔ ایسے برگزیدہ خاندان سے امیر یا شیخ نسلاً بعد نسلٍ منتخب ہو کر مقرر کیا جاتا۔ اہل عرب کے ہاں حارث کے عہدہ عظیم الشان ہیں وقتیں ...

پیچیدگیاں نہیں سیدھے سادے کام اسمیں ہوتے تھے۔ اگرچہ امیر و شیخ ہونے کا قاعدہ غیر منضبط
اور اوروں کی مرضی پر منحصر تھا اور اسکا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ امیر کے رشتہ داروں میں سے
کوئی نہایت لائق حسین متحمل عمر رسیدہ سنجیدہ شخص ایسا منتخب ہوتا تھا کہ اُس میں یہ قابلیت
ہوتی تھی کہ وہ اپنے صوابدید و رائے سے معاملات نزاع کو رفع کر دیتا تھا اور خود اپنی ذات سے
وہ چال چلن رکھتا تھا کہ اوروں کو شجاعت و دلاوری کے کاموں پر ہمت دہ ہوتا تھا مردانگی
کی راہ میں رہنما ہوتا تھا۔ یہاں تک اس قاعدہ کی پابندی تھی کہ اگر کوئی عورت جری اور عقیلہ
ہوتی تھی تو وہ عہدۂ امارت پر مقتدر ہوتی تھی۔ چنانچہ زنوبیہ کے باشندوں پر ایک عورت صاحب
فراست اور شجاعت حکمران تھی جب کئی قبیلے عرب کے تھوڑے عرصہ کے لئے متفق ہوتے تھے تو
انکا اجتماع سپاہ کی صورت دکھاتا تھا۔ اگر اس اجتماع کا زیادہ جماؤ ہوتا تو وہ ایک قوم معلوم ہوتی
تھی جس امیر الامرا کے علم کے نیچے وہ جمع ہوتی تھی قوم کی نظروں میں وہ بادشاہ دکھائی
دیتا تھا۔ عزت شاہانہ کا وہ مستحق سمجھا جاتا تھا۔

اہل عرب ہمیشہ امیروں اور شیخوں کی حلیمانہ و مربیانہ حکومت کے عادی تھے۔ اگر کوئی
ان میں سے اپنے اختیار اور اقتدار کی حد سے بڑے قدم رکھتا تھا۔ تو اس کو تنہا بے پناہ چھوڑ کر سب
الگ ہو جاتے تھے۔ پھر کبھی اسکے پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ یہی سزا امیر کو اپنی حد سے باہر قدم
نکالنے کی ہو جاتی تھی۔ یہاں کے لوگ آزاد منش تھے۔ کوئی احاطہ ایسا بنا ہوا نہ تھا کہ انکو گھیرے
رکھتا۔ کوئی ایسی بھاری بیڑی اُن کے پاؤں میں نہ تھی کہ اُن کو بھاگنے نہ دیتی صحرا کے فراخ
میدان کے میدان اُن کی جولانیوں اور دوڑ کے لئے خالی پڑے تھے۔ جدھر دل میں آئی
منہ اٹھایا چلے گئے ؎ ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست۔ ہاں جو زنجیر ان وارستہ مزاجوں
کو پابستہ کرتی تھی۔ وہ آپس کا اخلاص باوفا اور بے ریا تھا۔ ان کی آپس کی رضا و رغبت ہی انکو
یکجا جمع کرتی تھی ورنہ کوئی اور بندش ان کو ایک جگہ باندھ کر نہیں رکھ سکتی تھی۔

یمن کے نرم دل باشندوں نے بادشاہ کی شان و شوکت کو تسلیم کر کے غاشیۂ اطاعت
دوش پر رکھا۔ اور بادشاہ کی شان کے حامی دل و جان سے ہو گئے۔ اگر بادشاہ کا ایسا حال

ہوجاتا تھا کہ محل سے باہر نکلنے میں اُس کو جان کا خوف وخطر ہوتا تھا تو سلطنت کے تمام مہمات عظیم وامورات واحکامات اہم کا اختیار امرا ووزرا اور ارکین سلطنت کے ہاتھ میں آجاتا تھا۔ ایشیا میں سلطنت جمہوری نے اپنا رنگ مکہ ومدینہ میں جو ناف ایشیا میں ہیں دکھایا۔ آں حضرت کے جد امجد اور اُن کے خاندان کے اکابر اپنے ملک کے کاروبار اور غیر ملکوں کے معاملات میں گو بادشاہانہ اختیار رکھتے تھے اور بادشاہ معلوم ہوتے تھے مگر اُنکی حکومت دیانت ودانائی کے زور سے بھی انکے اختیارات ذوی القربیٰ میں وراثتاً تقسیم ہوتے تھے چنانچہ عصائے شاہی بڑوں سے چھوٹوں میں قوم قریش میں منتقل ہوگیا تھا۔

قاعدہ ہے کہ انسان اطاعت یا تو مجبوری سے اختیار کرتا ہے یا فہمایش سے جو ایسی فصاحت و بلاغت سے کی جائے کہ وہ دل وجان سے اُسکو برغبت قبول کرے۔ اہل عرب نے اُس زمانہ میں فصاحت وبلاغت میں وہ غضب کی قدرت وشہرت حاصل کی تھی کہ اُن کا ایک فصیح بیان اپنی قدرت تقریر سے ہزاروں کے دل تسخیر کر لیتا تھا۔ اور وہ اکیلا ایک جماعت کثیر سے جو کام چاہتا تھا کرا لیتا تھا۔ ان کے کلام کی تاثیر عوام کی آزادی پر شہادت دیتی ہے کہ ان کے دلو نپر اثر اطاعت کا نہ ہوتا تھا بلکہ کلام کا سحر سے وہ کسی ارادہ کرنے سے رُک جاتے تھے یا اُسپر جھک جاتے تھے۔ عرب کی آزادی اور یونان اور روم کی آزادی میں بڑا فرق یہ ہے کہ عرب کی سلطنت جمہوری سیدھی سادی تھی اور یونان وروم کی سلطنت جمہوری پیچ در پیچ تھی تصنع وتکلف سے وہ بھری ہوئی تھی ان میں ہر رکن اختیارات ملکی ومالی کا پیتہ رکھتا تھا۔ یہاں اپنی سیدھی سادی حالت میں ساری قوم عرب آزاد تھی۔ ہر شخص انمیں سے کسی آقا کی کمینہ اطاعت سے نفرت دلی رکھتا تھا۔ اس کا سینہ شجاعت وصبر وحلم واستقلال وہمت وجرأت کا مخزن تھا آزادی کا شوق اُس کو خود بخود سکھاتا تھا کہ وہ اپنے نفس کو اپنے بس میں رکھے اور اپنے اختیار کو سنبھالے رہے۔

عرب کے نزدیک عزت کے لئے مرجانا کوئی بات نہ تھی۔ اپنے ننگ وناموس کے لئے جان کھونے کو وہ تیار تھا۔ اور آزادی کے لئے ساری تکالیف ومصائب اُٹھانے کو گوارا کرتا تھا یہاں تک کہ مرنے کا بھی خوف ایسے موقعوں پر نہیں کرتا تھا اسکے بشرہ سے نہایت سنجیدگی علو ہمتی وجم پُرتی

انکی گفتار اختصار کے ساتھ متانت وفصاحت آہستہ آہستہ ہوتی تھی وہ کبھی اتفاق سے کسی بات پر خندہ کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی داڑھی پر ایک دلوانداز کے ساتھ ہاتھ پھیرا تھا داڑھی انسان کی جوانی اور مردمی کی نشانی ہے داڑھی پر ہاتھ پھیرنے میں یہ رمز تھی کہ وہ اپنی جوانی و بزرگی کو داڑھی سے بتلاتا ہے۔ اس ریش ہی کے لحاظ سے وہ اپنے ہمسروں کے ساتھ طفلانہ سفلوں کی سی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں سے باتیں کرنے میں کبھی نہیں جھجکتا تھا۔ ان کے رعب میں نہیں آتا تھا۔ زمانہ جاہلیت کی آزادی کا اثر اسلام کی ابتدا میں قائم رہا خلفائے اولیں نے اپنی رعایا کو مبالغہ گفتگو سے نہیں روکا۔ ان کے ساتھ وہ اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے کہ آپسمیں متعارف دوست بے تکلف باتیں کیا کرتے ہیں وہ دینی امور کی ہدایت کرتے تھے۔ کوئی عز وشان شاہانہ اپنی رعایا کو نہیں دکھاتے تھے ہاں جب اسلام کا دارالسلطنت دریائے دجلہ کے کنارہ پر بغداد میں منتقل ہوا تو خلفائے عباسیہ نے ایران اور روم کے بادشاہوں کی تقلید کر کے اپنے دربار کی شان وشوکت کو ایسا بنایا کہ جس سے بادشاہ کی نخوت عیاں ہو ورنہ پہلے خلفائے کو ان باتوں کی طرف ذرا بھی خیال نہ تھا۔

اقوام اور انسانوں کے حالات پر غور وخوض کرنے سے ہمکو وہ وجوہ اور اسباب معلوم ہو سکتے ہیں جن سے کہ ان میں نفاق ووفاق پیدا ہوتا ہے اور موانست انسانی میں کمی وبیشی ہوتی ہے اور معاشرت بدلتی رہتی ہے۔ اہل عرب اور انسانوں سے الگ تھلگ رہتے تھے غیروں کے ساتھ نہ پیوند رکھتے تھے نہ رشتہ اس سبب سے یہ امر ان کی عادت میں داخل ہو گیا کہ وہ دشمن اور اجنبی آدمی میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں کے دیکھنے سے ان کے دل میں تصور ایسے پیدا ہوتے تھے جو آپسمیں ملتبس ہوتے تھے انھوں نے اپنی لوٹ مار اور غارتگری کے مباح ہونے کے لئے ایک مسئلہ مذہبی بنا رکھا تھا جس پر عمل اور عقیدہ ان کا چلا جاتا تھا کہ وہ حضرت اسماعیل کے گھر سے اپنی ماں ہاجرہ سمیت اپنی سوتیلی ماں حضرت سارہ کے رشک وحسد کے سبب سے نکالے گئے تو ان کو خدا تعالیٰ نے یہ ملک عرب کہ ایک وادی غیر ذی زرع ہے عنایت کیا اور اجازت دی کہ جو کچھ اس سے حاصل ہو سکے حاصل کرو بس اپنے تئیں اس کم پیداوار کی زمین ملنے کو اور اولاد حضرت اسحاق اور اپنے نوع انسان کو

زیادہ پیداوار کی زمین ملنے کو یہ سمجھتے تھے کہ ہم ناحق اپنی ارث سے محروم کئے گئے ہیں اس لئے ہم جو اولاد اسحاق یا اور غیروں کو لوٹتے ہیں تو اپنی وراثت کا حصہ لیتے ہیں کچھ دغا بازی اور سینہ زوری نہیں کرتے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی چوری کا نام چوری نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کو تحصیل ملکی کہتے تھے جب کوئی عرب کسی آدمی کو لوٹتا تھا تو یہ نہیں کہتا تھا کہ میں نے آج یہ لوٹا بلکہ یہ کہے گا کہ میں نے یہ نفع کمایا۔ یہی سبب ہے کہ وہ غیروں کے لوٹنے میں دست درازی کرتے تھے۔ مگر انکے خود سارے خیمے اور گھر کھلے پڑے رہتے تھے وہ کبھی آپس میں ایک دوسرے کی چیز نہیں چراتے تھے +

اہل عرب کو جیسے تجارت کی عادت تھی ایسے ہی چوری و غارتگری کی طرف رغبت تھی۔ ریگستان میں جو کارواں جاتے تھے جب تک وہ فدیہ نہ دیتے تھے بدوؤں کے ہاتھ سے بچتے نہ تھے وہ اُن کو لوٹ لیتے تھے حضرت ایوبؑ کے زمانہ سے اہل عرب کے ہمسائے ہمیشہ اُن کی غارتگری کے شکار رہے۔ اگر بدو دور سے دیکھتا تھا کہ مسافر اکیلا چلا آتا ہے تو وہ اُس پر لپک کر جھپٹتا تھا اور اُس کو ڈانٹ کر کہتا تھا کہ کپڑے اتار کر رکھدے کہ تیری چچی (یعنی اُس کی زوجہ) ننگی بیٹھی ہے۔ اگر مسافر نے چپ چاپ کان دبا کر کپڑے اتار کر رکھ دئے تو خیر گذری پھر اُس شفقت و مہربانی کی نظر سے اور اگر مسافر نے اُس کے کہنے کو نہ سنا کہ کیا کہتا ہے یہ سر مقابلہ ہوا تو پھر یہاں کیا تھا سینہ میں شعلۂ غضب نے آگ لگادی اور اپنی حفاظت نفس کے لئے مشروع طور پر اپنے خوں کا کفارہ اس بیچارہ مسافر کی خونریزی کو سمجھنے لگا ایک چور یا دو چار ملکر چوری کریں تو وہ چوروں کے نام سے بدنام ہوتے تھے لیکن اگر گروہوں کا مجمع چوری کرے تو وہ جائز سمجھا جاتا تھا اور اس کا نام معزز و مشروع محاربہ رکھا جاتا تھا۔ پس جن آدمیوں کے طبائع یوں نوع بشر کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں ان میں جو چند اشخاص اس سے پلید ہو جاتی ہو کہ انتقام و قتل و غارتگری کی اجازت انکی اپنی قوم کی طرف سے تھی۔ فرنگستان کے نظم و نسق میں صلح و جنگ کا استحقاق صرف چند معزز فرمانرواؤں پر محصور ہوتا ہے اور اس استحقاق کے موافق عمل کرنیکا اختیار نفس الامر میں اور بھی کمتر فرمانرواؤں پر محصور ہوتا ہے۔ مگر ملک عرب میں ہر عرب فرمانروا تھا جسکی خطا کی کوئی پرسش نہ تھی اپنے ہموطن کو چاہے جلا کر مار ڈالے اور اپنے تئیں اس کام میں بے گناہ اور نام آور جانے۔ اتفاق قومی ان میں فقط زبان اور اطوار میں ایک پریشان طور پر تھا ہر فرقہ

ایک رئیس برائے نام حکومت رکھتا تھا۔ اس کو بہت اختیار اور اقتدار نہیں حاصل ہوتا تھا۔ جب معاملات ملکی میں نفاق برپا ہو جاتا تھا۔ تو آپس میں سخت عداوت ہو جاتی تھی جو جھگڑے و فساد ہو کر برپا بھی جاتے تھے انکا نظم و نسق بیٹھ جاتا تھا۔ تسخا صمین کی اولاد کے مابین کینہ و انتقام کی بجھی ہوئی آگ کو سلگا دیتا تھا۔ ہر شخص اپنے امورات خانگی میں اور ہر ایک خاندان اپنے معاملات کے فیصلہ کرنے میں منصف یا منتقم ہوتا تھا۔ ہر فرد کو اپنے ننگ و ناموس کا ایسا نازک خیال ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہتک کو گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اپنے بھاری نقصان کو اسکا پاسنگ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ عرب کے فسادوں میں یہ عزت کا خیال ایسا زہر اگلا کرتا تھا۔ ان کے عیش کو تلخ بنا دیتا تھا۔ اگر ان کی عورتوں یا داڑھی کی نسبت کوئی گستاخی کا کلمہ کسی کی زبان سے ذرا سا بھی نکل گیا تو وہ بہت چڑ جاتے تھے۔ اگر ایک نے دوسرے کی نسبت تحقیر کا لفظ کہدیا یا اور کوئی حرکت بیہودہ اسکے ساتھ کر بیٹھا تو اس کا عوض و انتقام تلوار سے ہی لیا جاتا تھا۔ وہ اپنے انتقام لینے میں استقلال اس صبر کے ساتھ کرتے تھے کہ مہینوں اور برسوں کمین لگائے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب موقع ہاتھ آئے کہ انتقام لیکر اپنے دل کو ٹھنڈا کریں۔ ہر زمانہ میں وحشیوں میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ قتل کے بدلے میں خونبہا و تاوان لے لیتے تھے۔ عرب میں یہہ دستور تھا کہ مقتول کے وارث یا دیت لیں یا اپنے ہاتھ سے قاتل سے قصاص لیں۔ اس کے سوا ایک عجیب صفائی ان کے کینہ میں یہ تھی کہ وہ قاتل کے سر لینے سے انکار کرتے تھے اور اس کے عوض یہ چاہتے تھے کہ قاتل جس قبیلہ کا ہو اس کے سب سے بڑے سردار کا سر اڑائیں تو ہماری ناموری ہے کہ اپنے ادنی آدمی کے عوض میں دشمن کے اعلیٰ افسر کا سر اڑایا۔ غرض وہ مجرم کے عوض ایک بیگناہ کا خون سر پر لیتے تھے۔ پس اگر قاتل کے گروہ میں انکا یہ نامی گرامی آدمی مارا گیا تو پھر طرف ثانی انتقام کے درپے ہوا۔ اس طرح دو آدمیوں کے لڑنے مرنے پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ ان کے ہاں کسی شخص کا خون ہو جانا ایک ایسا قرض تھا کہ جسکی اصل اور سود ہمیشہ جمع ہی ہوا کرتے تھے اور کبھی ادا نہ ہوتے تھے۔ طرفین کے دلوں میں روز بروز کینہ و پرخاش بڑھتا جاتا تھا۔ دونوں کی زندگی خوف و خطر میں بسر ہوتی تھی۔ بعض اوقات نصف صدی گزر جاتی تھی کہ اس انتقام کا حساب کتاب

بیباق نہ ہوتا تھا۔

بعض مسائل اور قوانین عزت کے باب مین اُنکے ہان ایسے تھے کہ ایسے خونخوار منیتوں میں بھی جو رسم و عفو سے معرا تھیں اعتدال پیدا کر دیتے تھے ان مسائل کا منشاء جو شائستہ تھا یہ ہوتا تھا کہ ہر خانہ جنگی میں طرفین عمر میں قوت میں تعداد میں ہتیاروں میں درجۂ مساوات رکھیں اس لئیے ہر سال میں دو یا چار مہینے ایسے مقرر کر رکھے تھے کہ اُنکے اندر قتل ممنوع تھا کہ نہ آپس میں لڑنے کے لئے نہ غیروں سے جنگ کرنے کے واسطے تلواریں میان سے باہر کرنی چاہئیں پس تھوڑے دنوں تک جنگ و پیکار سے باز رہنا اُن کی جنگ و جدل کی عادتوں اور ملک کی بدنظمیوں کو خوب عیان کرتا ہے۔ کوئی روایت کرتا ہے کہ اس زمانہ میں سترہ سو لڑائیاں ہوئیں کوئی بارہ سو تبلاتا ہے۔ ان بے باک اور بے قید عربوں کی معرکہ آرائیاں و خونریزیاں بڑی مشہور ہیں۔ ان میں سے دو ہم نقل کرتے ہیں۔ ایک حرب بسوس دوسری حرب داحس۔ حرب بسوس بنی بکر اور بنی تغلب کے درمیان ہوئی اسکا سبب تھا کہ کلیب ایک بڑا مشہور امیر عرب تھا۔ اُسنے حکم دے رکھا تھا کہ میرے چراگاہ میں کوئی اونٹ نہ چرنے پائے۔ ایک شخص قوم جرم کا جساس کی پھوپھی بسوس نامی کے پاس اُترا تھا اسکے ناقہ کا نام سراب تھا وہ چرتے ہوئے کلیب کی چراگاہ میں چلی گئی کلیب نے اُسپر تیر چلائے اور پھر اس کے تھن کاٹ لئے۔ یہ اونٹنی لہو لہان اپنے مالک کے پاس بڑبڑاتی ہوئی آئی بسوس نے اس کو لہو میں لتھڑا ہوا دیکھا وہ اُسکو پیار کرنے لگی اور یہ کہنے لگی کہ ہائے افسوس کیا میرے مہمان کو تکلیف ہوئی۔ جساس نے جب اپنی پھوپھی کو غمگین پایا تو تمام قوم کو جمع کر کے کلیب کو جا گھیرا وہ اپنے احاطہ میں پھر رہا تھا کہ جساس نے اس کے ایک نیزہ ایسا مارا کہ وہ مر گیا بس اتنی بات پر آتش جنگ برسوں تک مشتعل رہی جس کے شراروں میں ستر ہزار جانیں خاکستر ہو گئیں۔

وہ بکر و تغلب کی باہم لڑائی	صدی جس میں آدھی اُنھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی	تھی اک آگ برسوں عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ	کرشمہ اک اُنکی جہالت کا تھا وہ

جنگ داحس کا حال یہ ہے کہ عرب کا امیر قیس تھا اس کے پاس دو گھوڑے داحس اور غبرا نامی تھے

حذیفہ بن بدر کے گھوڑوں کے ساتھ دوڑ ہوئی دو دو سو شتروں کی شرط بدی گئی حذیفہ نے پہلے سے ایک آدمی ان گھوڑوں کی راہ میں بٹھا دیا تھا اور اس سے کہدیا تھا کہ اگر قیس کا گھوڑا اس کے آگے نکل جائے تو اس کو روک دینا۔ اس نے روکا مگر وہ نہ رُکا تو اس نے ایک ضرب شدید اس کی تھوتھنی میں لگائی جس سے وہ رُک گیا مگر دوسرا گھوڑا غبرا نہ رُکا اور حذیفہ کے گھوڑوں سے آگے نکل گیا۔ قیس بازی جیت گیا مگر حذیفہ اس پر حیلہ کرنے لگا اور کہنے لگا کہ دوبارہ پھر گھوڑوں کو دوڑاؤ۔ اس بات پر بنی قیس بنی بدر میں کینہ پیدا ہوا۔ چالیس برس تک خونریزی کا ہنگامہ برپا رہا۔ قبیلے کے قبیلے کٹ گئے۔ ہزار ہا تن بے سر ہو گئے۔ یہ جنگ ضرب المثل ہے غرض ایسے ہی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں + مسدس حالی

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار ان میں — یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

گو اہلِ عرب لوٹ مار میں نہایت سخت اور آپس میں انتقام لینے میں درشت تھے مگر تجارت اور علم ادب کی ملائم تاثیروں نے ان کی درشتی اور سختی میں اعتدال پیدا کر دیا تھا۔ ملک عرب ایک جزیرہ نما ہے اسکے گرد قدیم زمانہ کی نہایت مہذب قومیں آباد تھیں تاجر انسان کا خیر خواہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے چنانچہ اِن مہذب قوموں کے کارواں ہر سال وہاں جاتے تھے۔ اور علم اور اخلاق کے بیج عرب کے شہروں میں کیا بلکہ بیابان کے خیموں میں بوئے جاتے تھے۔ اہلِ عرب کا نسب خواہ کچھ ہی ہو مگر ان کی ابتدائی زبان کا درخت عبرانی۔ شامی۔ خالدیہ کے زبانوں کی گٹھلی سے پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ عرب کی طبیعت کی آزادی اور خودسری نے ایک ہی زبان کے قواعد کا پابند نہیں رکھا۔ اِن کے قبیلوں کی زبانوں میں کچھ نہ کچھ فرق رہا۔ مگر ہر ایک قوم اپنی گفتار خاص کے بعد مکہ کے خالص اور فصیح زبان کو ترجیح دیتی تھی۔ عرب میں اور نیز یونان میں فصاحتِ زبان کا کمال بہ نسبت اطوار کی تہذیب شائستگی کے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ایک بے علم قوم کے فقط حافظہ میں وہ بڑی کتاب لغت کی ودیعت تھی جسکے اندر شہد کے اسّی مختلف نام۔ سانپ کے دو سو۔ شیر کے پانسو۔ تلوار کے ہزار نام تھے

یمن میں حمیر کا خاندان سلطنت کرتا تھا۔ اُنکی عمارتوں میں کتابی خط سند میں کندہ ہوئے ہیں مگر یہ خط ایسا متروک الاستعمال ہوگیا ہی کہ اب اس کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ مگر خط کوفی جس سے خط نسخ نکلا ہے دریائے فرات کے کنارہ و نیز ایجاد ہوا تھا اور اِس نو ایجاد خط کی تعلیم ایک شخص نے اہل مکہ کو کی تھی اہل عرب کو فصاحت کلام کی استعداد خداداد تھی۔ وہ صرف و نحو عروض قوافی۔ بدیع بیان معانی کے علوم سے محض ناآشنا تھے۔ فصاحت اِن کا جوہر ذاتی تھا کہ اشراف خاندانوں کے بچے لطیف زبان طوطی ہزار داستان کی طرح اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتے تھے فکر سخن میں طبیعت انکی نہایت رسا اور صائب خیالات میں وسعت فہم مستحکم۔ ذہن نکتہ سنج۔ اِن کے کلام میں وہ تاثیر تھی کہ جب وہ اپنی رجز خوانی پر آتے تو ہزاروں سامعین کے دلوں کو اپنے بس میں کر لیتے تھے جدہر چاہتے تھے پھیر لیتے تھے۔ وہ اپنی فصاحت سے شجاعت کو جوش و خروش میں لاتے کہ مخالفوں کے جی چھوٹ جاتے جب اپنے کشتوں کی لاش پر نوحہ کرتے تو سُننے والوں کے آنسو نکل پڑتے۔ وہ علم الانساب۔ علم الانوار۔ علم التواریخ۔ علم تعبیر رویا رکھتے تھے +

شاعری کا شوق و علم

جب کوئی شاعر ہونہار اپنی قابلیت کو دکھاتا تو اِس کی خود قوم اور اقوام ستائش میں اسکی سرگرم ہوتیں کہ دور دور اُس کی شہرت ہو جاتی۔ اُسکی دعوت کا سامان کیا جاتا تھا۔ جسمیں عورتیں جمع ہو کر باجا بجاتیں اور بڑی دہوم دہام مچاتیں اور اپنے آوازوں کے سُروں کو ملاکر اپنے بیٹوں اور خاوندوں کے سامنے یہ گائیں کہ ہماری قوم کیا خوش اقبال ہی کہ اِس میں یہ ایک نوجوان بہادر پیدا ہوا ہی جو ہمارے تمام حقوق کی حمایت کریگا اور ہمارا نقیب ہی کہ اپنی آواز سے ہماری نیک نامی کا آوازہ بلند کریگا اور ہمارے نام کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشیگا عکاظہ جبل عرفات کے پیچھے مکہ کے پاس ایک مقام تھا جسمیں میلا ہر سال ہوا کرتا تھا۔ صدہا کوس سے لوگ اِس میں آتے تھے۔ اور اُن اقوام کے آدمی بھی آتے تھے جو آپس میں دشمنی رکھتے تھے۔ یہ میلا گویا ایک اجتماع قومی تھا جس سے اِن وحشی قوموں میں موافقت پیدا ہوتی تھی اور تہذیب پھیلتی تھی۔ وحشی بھی اہل دل میں اِس مِل بیٹھنے سے انسانیت آتی تھی تیس روز تک یہ میلا رہتا تھا۔ اِس میں فقط ہزاروں کا لین دین اور انگوروں ہی کا مبادلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ زیادہ تر فصاحت و شاعری کا بازار گرم ہوتا تھا

اِس بازار میں تمام اسبابوں میں جوہرِ سخن کے برابر کوئی چیز قیمت نہیں رکھتی تھی۔ صرافانِ جوہرِ سخن اسپر جمع ہوتے تھے۔ سخن کے کھوٹے کھرے کو پرکھتے تھے۔ ایک میدان میں سب جمع ہو کر خوش اسلوبی کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ ایک شاعر کھڑا ہوتا تھا اور اپنے شعر ازبر پڑھتا تھا۔ شاعر اپنی طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت لیجانے میں سعی کرتے تھے۔ اپنی برتری کی دلیلیں پیش کرتے تھے اسپر جھگڑا کرنے کو بھی تیار ہو جاتے تھے۔ پس جو کوئی اس میدان میں سبقت لیجاتا اس کی تحسین و آفریں کا آوازہ بلند ہو جاتا۔ اِس کے قصائد یا عبارتِ نثر صاحبِ امارت اور شاہزادے امیرزادے تبرک کی طرح لے جاتے تھے۔ اونٹوں و بکریوں کی جھلیوں پر یا ریشمی کپڑوں پر سنہری حرفوں میں لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کرتے تھے ان کو مذہبہ یا معلقہ کہتے تھے۔ چنانچہ سبعہ معلقہ اِن میں سے ابتک موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ سوائے اِن سات کے کوئی اور معلقہ باقی نہیں رہا۔ ان اشعار میں شجاعت۔ دل کی اُمنگیں۔ خونریزی۔ شرافتِ نسب۔ رفاقت باوفا۔ سخاوت۔ فرحتِ مقام دریاؤں کی روانی۔ جنگلوں کی ویرانی۔ پہاڑوں کی وحشتناکی۔ جنگلوں کی سرسبزی۔ حیوانات کی خوبی۔ اونٹ گھوڑوں کی تعریف۔ عشق معشوق کی تعریف۔ ہجر کی اُداسی۔ وصل کی مسرت اور اس قسم کے مضامین ہوا کرتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ شاعر اخلاق کے معلم اور اپنے زمانہ کے مورخ تھے وہ عرب کی خوبیوں اور نیکیوں کا اعزاز دلوں میں دلنشین کرتے تھے۔

سخاوت و شجاعت میں ایسا پیوند ہے کہ وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس رشتہ بندی ہی پر ان کے اشعار کا مدار تھا۔ سب سے زیادہ یہی مضمون دل پسند تھا۔ سخاوت۔ مہمان نوازی۔ بہادری شجاعت سے اِن کا تمام کلام مرصع ہے گو بدیع و معانی و بیان سے معرا ہے۔ جب وہ کسی مبتذل قوم کی ہجو کر کے خاکہ اُڑاتے تھے تو اس کو سخت طعن سے یہ بھی کہتے تھے کہ مردوں کو دینا اور عورتوں کو انکار کرنا نہیں آتا۔ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوانِ نوال اہلِ عرب کے خیموں میں نظر آتا تھا وہ تندخو بدو جو بیابان میں کسی شخص کی جان کا خواہاں ہوتا اگر وہ بغیر صحبت اِس کی بات پر اعتماد کر کے اِس کے خیمے میں آجاتا تھا تو وہ پھر اس سے معانقہ کرتا تھا۔ محبت کے ساتھ اِس کی تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ مہمان بناتا تھا۔ وہ اپنی دولت و افلاس میں شریکِ حال کرتا تھا۔ وہ بقدر اسکی حاجت کے

اپنے گھر میں رکھتا تھا۔ پھر اس کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ دعائیں دیکر رخصت کرتا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ کوئی عطیہ بھی کر دیتا تھا۔ سخاوت ان میں ایسی تھی کہ محتاج بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ وہ دست و دل کشادہ رکھتے تھے +

شجاعت کا حال یہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی شرط حزم و احتیاط و تجربہ کی نہیں لگاتے تھے کہ جس سے اس کا احاطہ تنگ ہو جائے۔ ان کے بہادرانہ کام مدح و ستائش عام کے قابل جب ہی شمار ہوتے تھے کہ وہ اس تنگ احاطہ سے باہر ہوتے تھے۔ اہل عرب کی ساری خوبیوں کا حال اگر کوئی دیکھنا چاہے تو وہ حاتم طائی کے خصائل میں دیکھ لے۔ اس سخی کا نام ایسا ہے کہ اسکو جاہل سے لیکر عالم تک ہندوستان کے سب جانتے ہیں وہ قبیلہ بنی طی کا سردار تھا۔ وہ اہل عرب کی تمام نیکیوں کا آئینہ تھا جوانمرد بہادر۔ فیاض دریا دل۔ شاعر فصیح بیان۔ جنگ و پیکار میں کامگار و کامران مہمان نواز ایسا کہ چالیس اونٹ جسکے ہاں دعوت میں قربان ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے جانی دشمن کی منت سماجت کرنے پر تمام مال و متاع و قیدی و غلام اس کے واپس کر دئیے۔ شہ ھ میں اُس نے وفات پائی۔ عرب کی آزادی کا اقتضا۔ قوانین عدالت کی پابندی سے ان کو نفرت دلاتا تھا۔ ان میں جو جبلی عادت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ رحم۔ تھا۔ اس سے وہ مستفید ہوتے تھے۔ اسی کو وہ اپنا فخر اور جوہر ذاتی سمجھتے تھے۔ قوانین و آئین کی پابندی سے جو خوبیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ان کے نزدیک ذلیل و حقیر تھیں +

بدوؤں کے دل سخی اور قلب جری۔ ان کے لغت فصیح۔ زبان بلیغ۔ نسب صحیح۔ حسب شریف۔ انکی زبان سے کلام ایسا روان نکلتا تھا جیسے تیر کمان سے۔ وہ دلوں پر اثر کرتا تھا۔ نسیم بہار اور آب شیریں سے زیادہ لطف دیتا تھا۔ وہ بھوکوں کو مصیبت میں کھانا کھلاتے تھے۔ میدان جنگ میں زبردستوں سے لڑنے مرنے کو تیار ہوتے تھے۔ یہ ان کو کب گوارا تھا کہ کوئی غیر ان کا دل دکھائے۔ اور اپنا تابع بنائے۔ اور ان کی عزت کا خواہاں ہو۔ وہ اپنے ہمسایہ کے ایسے حامی ہوتے تھے کہ اس کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ گھر کی عورتوں پر کسی کی نظر بد نہیں پڑنے دیتے تھے۔ امیروں شریفوں کو ذلیل نہیں ہونے دیتے تھے +

اہل عرب جو اجرام فلکی یعنی چاند، سورج، ستاروں کی پرستش کرتے تھے وہ صابئین کہلاتے تھے۔ عبرانی زبان میں صابئین کے معنی ستارے کے ہیں۔ یہ اجرام فلکی کی پرستش انسان کے توہمی مذہب کا اختراع اول ہے۔ یہ مذہب اور مذاہب باطلہ میں زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ ان اجرام فلکی کا نور جو سارے زمین اور آسمان پر چمکتا ہے۔ وہ ذات الٰہی کے نور کی تصویر آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ انکی تعداد اور ابعاد عظیم جاہلوں کی نظر میں ایک وسعت غیر متناہی کا تصور باندھ دیتی ہیں۔ ان نورانی مجسم کروں میں کبھی زوال و تنزل کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کا ازلی و ابدی ہونا ان کی ذات ہی سے خود عیاں ہوتا ہے۔ اُن کی حرکتیں ایسے انضباط و قواعد کے ساتھ ہوتی ہیں کہ ان میں حرکت آزادی اور عقل انسانی و حیوانی کے موجود ہونے کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ تاثیرات کواکب خواہ وہ خیالی ہوں یا اصلی ہوں اعتقاد باطل کی تقویت اس امر میں کرتی ہیں کہ وہ زمین کے باشندوں کی خبرگیری اور اُن کے کاموں کا انتظام و انصرام کرتی ہیں۔ علم ہیئت کی بنا بابل میں پڑی۔ مگر اہل عرب کی اُستادی اس علم میں ان کے صفائی مطلع آسمانی اور بیابانوں کی کفِ دستی نے پیدا کی۔ ان کے راتوں کے سفروں میں یہ ستارے ہی رہنمائی کرتے تھے۔ بدؤں کو ان کے نام اور ترتیب اور منازل معلوم تھے اور اُن کا تفحص و تجسس ان کی عادت میں داخل تھا۔ انہوں نے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے دورِ قمر کو اٹھائیس منازل میں تقسیم کیا تھا اور ان ستاروں کے اقترانوں کو نہایت سعد سمجھتے تھے کہ جن میں بارش ہوتی تھی اور ان کی خشک لب زمین کی پیاس بجھتی تھی۔ یہ تاثیرات اجرام فلکی تو جسمانی تھیں وہ صرف مادیات میں محسوس ہوتی تھیں۔ یہ ستارہ پرست انواء منازل اور ستاروں اور منجمین کا بہت اعتقاد رکھتے تھے سب کام انکے انواء پر مقرر تھے وہ کوئی حرکت و جنبش ہی نہ کرتے جب تک وہ موافق نوء کے نہ ہوتی اور کہا کرتے تھے کہ اکثر دفعہ فلانی نوء کے سبب ہمارے ملک میں مینہ برسا۔

انکے مذہب میں روحانی مسائل کی بھی ضرورت تھی سو وہ تناسخ ارواح اور حشرات اجسام کے قائل تھے۔ مردہ کی قبر پر ایک اونٹ مردے کے لئے باندھ دیتے تھے کہ وہ دوسرے جنم میں اس کی خدمت کرے۔ مردوں کی روحوں کی حاضرات کی جاتی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بقائے روح کے مرنے کے بعد قائل تھے

اور یہ سمجھتے تھے کہ اسکو علم ہوتا ہے اور وہ قدرت رکھتی ہے +

بالتفصیل بتلانا نہایت مشکل کام ہے کہ ان کے دیوتا کون کون سے تھے اور کن کن مقاموں سے مخصوص تھے کون کونسے کواکب کی وہ پرستش کرتے تھے عناصر کی عبادت کیونکر کرتے تھے ان کی تذکیر و تانیث کو کیونکر مانتے تھے یعنی کیونکر دیوتا اور دیبی مقرر کرتے تھے۔ ان کے کیا خطاب و القاب تھے۔ کیا کیا اُنکے صفات بیان کئے جاتے تھے +

ان میں سے چند مشہور باتیں لکھتے ہیں کہ اہل عرب میں ہر فرقہ و قبیلہ اور خود مختار جنگ باز اپنی رسوم عبادت اور من مانے معبود کو جب چاہتا بدل ڈالتا تھا۔ مگر ہاں کل قوم کا اس میں اتفاق تھا کہ مکہ کو تیرتھ کی جگہ مانے اسکو کبھی نہیں بدلا اس کے بتوں کے آگے ہمیشہ سر جھکایا۔ اور وہاں کی زبان کی عظمت کا اعتقاد رکھا۔ ملل و نحل میں شہرستانی لکھتا ہے کہ زمانہ جاہلیہ میں اہل عرب کے کئی فرقے تھے ایک فریق خدا تعالیٰ کا بالکل منکر تھا اُسکا یہ مقولہ تھا کہ ہر ایک شی اپنی طبیعت سے زندہ ہو جاتی ہے اور دہر یا زمانہ اسکو مار ڈالتا ہے اور پھر وہ زندہ نہیں ہوتی۔ دوسرا فریق خالق کا اقرار کرتا تھا مگر مر کر پھر زندہ ہونے سے انکار کرتا تھا۔ ایک فریق بتوں کو پوجتا تھا اور ہر قبیلہ کے ساتھ ایک بت مخصوص تھا اور وہ ایک جگہ قائم تھا ہبل سب بتوں میں معزز و معظم بت تھا وہ کعبہ میں تھا اور آساف نائلہ صفا و المروہ میں لات قبیلہ ثقیف کا طائف میں قریش کا اور بنی کنانہ کا بت عزےٰ تھا۔ اوس اور خزرج کا منات۔ بعض فرشتوں کو سجدہ کرتے تھے اور بعض جنوں کو پوجتے تھے۔

کعبہ کی قدامت میں کسیکو کلام نہیں اسکا ذکر حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ سے پیشتر کی تاریخوں میں موجود ہے۔ ایک بڑا قدیمی یونانی مورخ بحر احمر کے ساحل کے ذکر میں لکھتا ہے کہ ثمود و صابئین کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جسکو سب اہل عرب مقدس سمجھتے ہیں اول ہی اول حمیر کے ایک دیندار بادشاہ نے جو سات برس پہلے آنحضرتؐ سے تھا کتان یا ریشم کا پردہ کعبہ پر چڑھایا تھا۔ جسکی نقل اب تک سلطان روم کرتا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کے پردہ کو ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ وحشیوں کی پرستش کے لئے تو ایک خیمہ یا غار کوہ کافی تھا۔ مگر کعبہ اُنکے واسطے پتھر اور چکنی مٹی کی عمارت بنگئی تھی۔ اس عمارت کی اصلی سادگی اب تک موجود ہے۔ اس میں مشرقی بادشاہوں نے اپنے اقتدار اور

ہنر مندی کو زیادہ نہیں خرچ کیا۔ کعبہ کے چاروں کونوں پر ایک ایوان تھا۔ اس میں خانہ کعبہ مربع ۲۴ ہاتھ لمبا اور ۲۳ ہاتھ چوڑا اور ۲۷ ہاتھ بلند تھا۔ ایک دروازہ اور ایک کھڑکی روشنی کے واسطے تھی۔ دوہری چھت تین ستونوں پر قائم تھی۔ اسمیں ایک پرنالہ مینھ کے واسطے پانی کے نکالنے کے لئے تھا چاہ زمزم پر ایک برج بنا ہوا تھا کہ اس میں کوئی ناپاک چیز اور پرندے نہ پڑیں۔ قریش کا قبیلہ قدیم سے مکہ میں رہتا تھا اور معزز شمار ہوتا تھا۔ اس کے لوگ مکہ کی آبادی بڑھانے میں کوشش کرتے تھے تجارت کا انتظام کرتے تھے۔ بنی ہاشم کا خاندان بڑا نامی اور بزرگ تھا وہ کعبہ کا متولی تھا ہر سال کے آخر مہینہ میں وہاں لوگ حج (حج کے معنی قصد کے ہیں اور سال کے بھی ہیں اسواسطے خواہ اس خیال سے کہ وہاں آنے سے قصد عبادت کا ہوتا تھا یا سال بسال وہاں جمع ہوتا تھا اس سفر کا نام حج ہو گیا تھا) کو آتے تھے۔ مناسک و مراسم حج جو اس زمانہ جاہلیت میں تھے وہ اسلام کے زمانہ تک بھی قائم رہے۔ ہر ایک قبیلہ نے اپنا اپنا بت لیجا کر خانہ کعبہ میں رکھا تھا اسلئے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے جنمیں بعض آدمیوں کے بعض ہاتھی کے بعض شیر کے اور بعض ہرن وغیرہ شکل کے تھے ان سب میں ہبل ممتاز تھا سرخ پتھر کا وہ بنا ہوا تھا وہ اہل شام کی صنعت کی یادگار تھی۔ وحشیانہ میں اہل عرب ایک کھڑا پتھر عبادت کے واسطے رکھ لیتے تھے یا کسی چٹان میں بتوں اور قربان گاہ کو بنا لیتے تھے۔

دنیا میں جاپان سے لیکر پیرو تک قربانیوں کا عام رواج ہے۔ قربانی کرنیوالے اپنے دیوتاؤں کی پرستش اور بندگی اس میں سمجھتے ہیں کہ جو چیز ہم کو سب سے زیادہ عزیز ہو اس کو ذبح کر کے قربان کر ڈالیں سب سے زیادہ عزیز انسان کو اپنی جان ہے وہ بھی ان پر قربان کرنی بڑی عبادت سمجھی جاتی ہے بعض بتخانے ایسے ہیں کہ ان پر انسانوں کی قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہ رسم عرب میں بھی بہت مدت تک جاری رہی کہ ایک لڑکے کی قربانی کعبہ میں بتوں پر چڑھاتے تھے۔ باپ کا اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے ہاتھ پکڑ کر بتخانہ میں لیجانا عجیب ہی جوش اور دیوانگی کی مثال ہے یہ کام وہی کرتے تھے کہ بڑے بہادر اور جری و مقدس و متبرک ہوتے تھے چنانچہ آنحضرتؐ کے دادا نے بھی یہ نیت مانی تھی کہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرونگا۔ مگر جب آنحضرتؐ کے والد پیدا ہوئے تو

انھوں نے اس قربانی کے عوض کفارہ میں اونٹ دئے۔ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کو بھی مثل یہود
سور کے گوشت کھانے سے پرہیز تھا۔ اولاد کا ختنہ بھی وہ کراتے تھے۔ ماں بیٹی سے نکاح
نہیں کرتے تھے اور سگی بہنوں سے بیاہ کرنے کو برا جانتے تھے جو شخص اپنے باپ کی بیوی سے نکاح
کر لیتا تھا اسکو بہت ہی برا جانتے تھے۔ افلاس کے سبب سے رسم دخترکشی رائج تھی۔

عرب آزاد ملک تھا ہمسایہ کی سلطنتوں میں فتوحات اور ظلم کے سبب سے ہل چل پڑتی تھی تو
ستم رسیدہ اور جفا دیدہ لوگ یہاں چلے آتے تھے جہاں جانتے تھے کہ جو ہم چاہیں گے اپنے خیالات
رکھیں گے اور جو اپنا پیشہ ہو وہ کرینگے۔ صابئین۔ یہودیوں۔ عیسائیوں۔ مجوسیوں کا مذہب
بالکل خلیج فارس سے بحر احمر تک خارج ہو چکا تھا۔ بہت قدیم زمانہ میں صابئین کا مذہب خالدیہ والوں
کے نجومیوں کے علم سے اور عصریہ والوں کی تلوار سے ایشیا میں پھیلا تھا۔ وہ ہزار برس کے عرصہ
میں اپنے مشاہدات اور تجربوں سے بابل کے نجومیوں اور پیرو مرشدوں نے انتظام و تدبیرات
الٰہی اور فطرت کے قوانین ابدیہ دریافت کئے وہ سات دیوتاؤں فرشتوں کی عبادت
کرتے تھے۔ ان دیوتاؤں کو کہتے تھے کہ وہ سبعہ سیاروں کو اپنے مدار میں چلاتے ہیں وہ اپنا اثر زمین پر
ایسا کرتے ہیں کہ جسکا مقابلہ کسی سے نہیں ہو سکتا۔ سبعہ سیارہ کی صفات کو اور بارہ برجوں اور
چوبیس اشکال شمالی و جنوبی کو تصاویر سے تعبیر کر کے اُن کا نام طلسمات اور ہیاکل رکھا تھا صابئین
دن میں تین دفعہ نماز پڑھتے تھے حیرہ میں ایک ہیکل قمر تھی وہاں حج کو جاتے تھے ان کا
مذہب ایسا لچکدار تھا کہ کچھ آپ سیکھتا تھا۔ اور کچھ اوروں کو سکھاتا تھا آفرینش عالم طوفان
نوح کے ماننے میں وہ اپنی قدیمی یہودیوں کا سا مذہب رکھتے تھے حضرت آدم اور حضرت شیث
اور حضرت یونس کے مصحف کو مانتے تھے جنکو وہ مخفی رکھتے تھے بصرہ کے عیسائیوں کے عقائد کی
بھی چاشنی اپنے دہریہ پن میں ملائی تھی۔ بابل کی قربانگاہیں مجوسیوں نے تہ و بالا کر دی تھیں
صابئین کو جو نقصان ان کے ہاتھ سے پہونچے تھے اس کا عوض سکندر اعظم نے خوب لیا تھا
ایران پانسو برس تک غیر قوموں کی حکومت کے جوئے کو اٹھاتا رہا اور واویلا کرتا رہا۔ بعض
زردشت کے مذہب والے بت پرستی کی وبا سے بچ کر آزادانہ زیست بسر کرنے کیلئے عرب میں چلے گئے تھے

عرب میں صابئین

آں حضرتؐ کی وفات سے سات سو برس پہلے یہودیوں نے عرب میں سکونت اختیار کی تھی طیطوس اور ہیڈرین کی لڑائیوں کے سبب سے ارض مقدس سے بہت سے یہودی ملک عرب میں جا بسے تھے ۔ یہ جلائے وطن جفاکش آزادی اور قدرت کو چاہتے تھے ۔ انھوں نے اپنے معابد و شہر و قلعے جنگلوں میں بنائے تھے اور غیر قومیں جو یہودی ہو گئیں تھیں وہ بنی اسرائیل کے ساتھ خلط ملط ہو گئیں ان میں ظاہری نشانی ختنہ کی ایک ہی تھی +

عیسائی مشنری اپنے کام میں مستعد اور نہایت کامیاب تھی کیتھولک مذہب کی حکمرانی تھی ۔ جن عیسائی گروہوں کو انھوں نے دبایا تھا وہ رومیوں کی سلطنت کی حد سے پرے نکل گئے تھے ان کی انجیل اور عقائد رومن کیتھولک کے سے نہ تھے ۔ انھوں نے یمن میں اپنے کلیسا قائم کئے اور آزاد ہو گئے غرض یوں عرب جو اپنے مذہب میں آزاد تھا اس کے ساتھ یہ یہودی ۔ عیسائی مجوسی اور صابئین بھی شریک ہو گئے ۔ یہ جو اجنبی قومیں یہاں آکر آباد ہوئیں ان سب کے فاضلوں کا اس مسئلہ پر اتفاق تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے ۔ زمین اور آسمان سب اسکے محکوم ہیں اس نے انسانوں میں اپنا الہام بذریعہ فرشتوں اور پیغمبروں کے بھیجا ہے ۔ اور اس نے اپنے فضل و کرم اور عدل سے معجزات اسکے خرق عادات فطرت کیا ہے ۔ عرب کے مہذب و خاص لوگ خدا کو ایک مانتے تھے ۔ مگر اس کی عبادت میں بڑی غفلت کرتے تھے ۔ بتوں کی عبادت کی عادت ان کو تھی گو اسکا اعتقاد نہ بھی ہو ۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے عہد عتیق و عہد جدید عربی زبان میں ترجمہ ہو گئے تھے +

انجیل طفولیت جو آج کل عیسائیوں کے مذہب سے خارج سمجھی جاتی ہے اسکا رواج تھا ۔ یہودیوں کو اہل عرب اپنی قوم کا اب (باپ) سمجھتے تھے + وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت اور انکے وعدوں کی تعریف کرتے تھے حضرت ابراہیمؑ کے مذہب کا ادب و تعظیم کرتے تھے اپنے تئیں اور یہودیوں کو ایک باپ کی اولاد جانتے تھے ۔ راہب اور کاہنوں نے اعتقاد رکھتے تھے ۔ معلوم نہیں کس زمانہ سے سارا جزیرہ عرب مکہ سے بھی روحانی کیفیات سے محض ناآشنا تھا یہودیت و نصرانیت و فلسفہ کا اثر ملک عرب پر ایسا اوپری اوپری خفیف ناپائدار تھا جیسے کہ کسی آب

ایستادہ پر لہروں کا اثر ہوتا ہے کہ وہ اسکی سطح بالا کو تو متحرک کرتی ہیں مگر تہ میں انکا کچھ اثر نہیں ہوتا وہ بے حس و حرکت رہتی ہے۔ کل عرب توہمات باطلہ میں گرفتار۔ بدکاری میں ڈوبا ہوا۔ خدا پر کامل ایمان نہیں رکھتا تھا غیر مرئی ارواح کے توہمات باطلہ پر ایمان۔ انہیں کی رضا مرضی پر دل و جان سے فدا۔ انکی ناخوشی سے ہراساں۔ نہ قیامت کا نہ اعمال کی سزا و جزا کا قائل۔ غرض جب یہ حالت ملکِ عرب کی تھی + مسدس حالی +

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بوقُبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جسکی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا — دعائے خلیلؑ و نویدِ مسیحا

باب دوم

دنیا میں اہلِ عرب کی سلطنت کن کن ملکوں میں قائم ہوئی پھر یہ کل سلطنت کن کن حصوں میں منقسم ہوئی اور پھر ان حصوں میں ہر ایک کتنے حصوں میں تقسیم اور ہر حصہ میں کون کون سے دودمان خلفاء نے حکومت کی اور کہاں کہاں انکے شعبے پھیلے اور کن کن خاندانوں کے پادشاہ ہوئے +

خلفاء

(۱) خلفاء راشدین (۲) خلفاء بنی اُمیہ (۳) خلفاء عباسیہ

فصل اول خلفاء راشدین و بنی اُمیہ و عباسیہ

آنحضرتؐ کی وفات سنہ ۱۱ھ مطابق ۶۳۲ء میں ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ بعد انکے جانشین بالترتیب حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ ہوئے۔ ان خلفاء راشدین میں سے کسی کی اولاد میں سلسلہ خلافت نہیں چلا حضرت علیؓ کے بعد جناب امام حسن چھ مہینہ تک برائے نام خلیفہ رہے پھر خلافت انھوں نے خود امیر معاویہ کو سپرد کر دی سنہ ۴۱ھ میں امیر معاویہ خلیفہ ہوا۔ وہ آنحضرتؐ کی قوم قریش میں سے امیہ کے خاندان میں سے تھا اسلئے اس خاندان کا نام بنی امیہ یا اموّیہ ہے اُس خاندان میں سلسلہ خلافت قائم ہوا اور اسمیں چودہ خلیفہ متواتر ہوئے۔ انکا دار الخلافہ دمشق تھا سنہ ۱۳۲ھ میں سوا اسپین کے کہیں اور اس خاندان کی خلافت نہیں قائم رہی۔ آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباس کے

خاندان نے اس بنی امیہ کے خاندان کو معزول کیا اور اپنے خاندان میں سلسلہ خلافت کو جاری کیا
اور بغداد کی ۱۴۵ھ ۷۶۲ء میں بُنیاد ڈالی اور اُس کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ اس خاندان کو ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں
ہولاگو خاں (ہلاکو خاں) نے معزول کیا۔ مصر میں قاہرہ کے اندر یہ خاندان عباسیہ برائے نام خلیفہ کا لقب
عظیم رکھتا تھا اور اُسکی روحانی برکت او عظمت مانی جاتی تھی مگر عثمانی سلطان سلیم اول نے یہ لقب
بھی اُنسے سلاطین قسطنطنیہ کے لئے چھین لیا۔ اب سلطان روم مسند خلافت عظمی پر جلوہ افروز ہوتا ہے
جس وقت حضرت ابو بکر خلیفہ ہوئے تھے تو اہل عرب کی سلطنت نے اپنا قدم ملک عرب سے باہر نہیں نکالا تھا
مگر خلفاء راشدین کے عہد خلافت میں ملک پر ملک فتح ہوتے گئے عرصہ قلیل میں سلطنت عرب کو وہ
وسعت حاصل ہو گئی جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں کمتر ملے گی۔ متواتر فتوح سے ۱۲ھ ۶۳۳ء میں عراق عرب پر
قبضہ ہوا اور شہر حیرہ پر تسلط ہوا۔ ۱۳ھ ۶۳۴ء میں یرموک کی لڑائی سے شام میں سلطنت اسلامیہ کو راہ
ملی ۱۴ھ ۶۳۵ء میں دمشق فتح ہوا ۱۵ھ ۶۳۶ء میں ایمیسا انطاکیہ اور یروشلیم تسخیر کیا اور ۱۷ھ ۶۳۸ء میں
سے شام بالکل مطیع ہوا اسی اثناء میں ۱۴ھ ۶۳۵ء میں جنگ قادسیہ اور فتح مداین سے ۱۶ھ ۶۳۷ء میں
ان عرب و عجم پر بالکل تسلط ہوا اور بصرہ و کوفہ کی بنیاد قائم ہوئی ۱۸ھ ۶۳۸ء میں سلطنت پر خوزستان
و لستر کا اور اضافہ ہوا ۲۱ھ ۶۴۲ء میں نہاوند کی لڑائی نے ایران کے خاندان ساسانیہ کو بالکل ستیاناس
ملاکے خاک میں ملا دیا اور سارا ایران مسلمان ہو گیا ۲۱ھ ۶۴۱ء میں ہرات پر اسلام کا ڈنکہ بجا اور وہاں سے
پھر سارے افغانستان میں ہند تک اسلام کی اعلام ظفر قائم ہوئی اور سندھ میں انکی سلطنت کی بنیاد
پڑی ۵۴ھ ۶۷۴ء میں بخارا پر اور دو برس بعد سمرقند پر تصرف ہوا۔ ماوراء النہر کئی دفعہ کی تاخت و تاراج
کے بعد ۹۳ھ ۷۱۱ء میں بالکل مطیع ہو گیا غرض عرب سے باہر جب ملکوں کے فتح کرنے کے لئے اہل اسلام نے قدم
رکھا! چالیس برس کے عرصہ میں اپنی کشورکشائی کو مشرق میں حد غایت کو پہنچایا۔ مگر مغرب میں ملک گیری
میں کچھہ توقف ہوا ۲۱ھ ۶۴۱ء میں مصر تسخیر کیا ۲۶ھ ۶۴۶ء میں بربر پر تاخت و تاراج کو ردمیوں کے کنارہ تک
پہونچایا۔ بربر کے جفاکش وحشی باشندوں کو زیر کرنا ایسا آسان کام نہ تھا جیسا کہ ایران و یونان و شام
و مصر کے عیش دوست باشندوں کو محکوم بنانا ۵۰ھ ۶۷۰ء میں قیروان کی بنیاد قائم ہوئی اور وہ افریقہ کا
دار السلطنت مقرر ہوا ۸۲ھ ۷۰۲ء میں کارتھیج تسخیر ہوا۔ عرب کی لشکر کشی بحر اطلانٹک تک پہونچی تخیر کے

سنہ ۹۱ھ میں اندلس (سپین) جبرم اخل ہوئے ۹۲ھ میں تولی دو کی لڑائی سے یہ گوتھک کی سلطنت سپین اہلِ عرب کے ہاتھ آئی ۱۱۴ھ میں طورس پر فتح حاصل کر کے جنوبی فرانس پر قابض ہوئے اور برگنڈی اور ڈافنی کو تاخت و تاراج کیا۔ غرض خلفاء عرب نے ایک صدی میں مغرب کی طرف وسعت عظیم میں اپنی سلطنت کو قائم کر لیا۔ شمال میں یونانیوں کے پاس صرف ان ٹولیا تو باقی رہا وہ خلفاء کے قبضہ میں کبھی نہیں آیا۔ مگر مسلمانوں نے آرمینیا کو فتح کیا ۔ ۳۱ھ ارض روم پر پہونچے ۲۹ھ جزیرہ قبرس (سائی پرس) کو فتح کیا ۔ ۵۰ھ سے قسطنطنیہ کو محاصرہ کئی دفعہ کیا +

پس اس طرح خلفاء عرب کی سلطنت کو یہ وسعت حاصل ہوئی کہ بحر اطلانٹک سے سندھ تک اور بحر کیسپین (خزر) سے رود نیل کے آبشاروں تک پھیل گئی جب سلطنت کو یہ وسعت عظیم حاصل ہو تو ایک بادشاہ کا یہ کام نہ تھا کہ سب کو یکجا جمع رکھ پاتا لہٰذا کرنا ضرور تھا کہ وہ حصوں میں جدا جدا منقسم ہو سب سے اول اندلس (سپین) نے عرب کی خلافت سے کنارہ کشی کی عبدالرحمٰن جو معزول خاندان بنی امیہ کا ایک رکن تھا وہ ۱۳۸ھ میں بالکل اندلس کا خود مختار اور آزاد سلطان تسلیم کیا گیا اور اُسنے خاندان عباسیہ سے کچھ اپنا تعلق نہیں رکھا۔ تیس برس بعد ادریس جو حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھا اور اسلیئے وہ خاندان بنی امیہ اور خاندان عباسیہ دونو کا مخالف تھا۔ مراکش (مراکو) میں خاندان علویہ کی آزادانہ سلطنت کی اور ۱۷۲ھ میں فاس کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ باقی شمالی افریقہ کا ایک حصہ بھی خلافت سے نکل گیا اسمیں خاندان اغلبیہ کو غلبہ ہوا اور ۱۸۴ھ میں قیروان کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ آیندہ صدی میں مصر اور شام دونو خلافت کی فرمانبری سے نکل کر خود مختار فرماں روا ہو گئے ۲۵۴ھ میں طولون آزاد بادشاہ ہوا یہ سچ ہے کہ خاندان طولون کی حکومت کے بعد ۳۰ برس تک خاندان عباسیہ کی طرف سے پھر یہاں حاکم مقرر ہونے لگے تھے مگر ۳۲۳ھ میں اخشیدیہ خاندان نے اپنی سلطنت جدا جمائی بعد اسکے دریا فرات کے مغرب میں کسی ملک نے معاملات ملکی میں خلفاء بغداد کی اطاعت نہیں کی۔ مگر دینی اطاعت کو نہیں چھوڑا خطبوں میں اور سکوں میں انہیں خلفاء بغداد کا نام ہوتا تھا۔ مگر سپین اور مراکش میں نہ سکہ پر انکا نام تھا نہ خطبہ میں انکا نام پڑھا جاتا تھا +

مشرق میں بھی خاندان عباسیہ کی حکومت سے ملک آزاد ہو جاتے تھے ۲۰۵ھ میں مامون رشید خلیفہ کا نامور

سپہ سالار ہارون الرشید امیر المومنین جب مشرق میں نائب خلیفہ مقرر ہوا تو اُسنے خلیفہ سے سرتابی کی اور خود مختار ہوگیا۔ اسکے بعد اور خاندان صفاریہ۔ سمانیہ۔ وغزنویہ پیدا ہوئے اور جُدا جُدا اپنی سلطنت کرنے لگے۔ خلفاء کی دینی بزرگی کو یہ سارے خاندان تسلیم کرتے تھے مگر مشرقی اضلاع ایران اور ماوراء النہر کی ساری دولت اور حکومت کو اپنے قبضہ اقتدار میں رکھتے تھے۔ تیسری صدی کے وسط سے دولت عباسیہ میں ترکی سپاہ کا بڑا غلبہ ہوتا جاتا تھا باقی ملک بھی خاندان بنی بویہ کے قبضہ میں آگئے ۳۳۴ھ میں بغداد بھی انھیں کے پاس تھا اس سنہ سے خلفاء عرب کی سلطنت کسی ملک میں باقی نہ رہی مگر انکا شاہانہ دربار نہ موقوف ہوا تھا اور ۶۵۶ھ میں مغلوں نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا یہ ایک امر اتفاقی تھا کہ خلیفہ ناصر نے اپنے محل کی دیواروں کے باہر بھی حکومت کی اور عراق عربی (کالڈیا) پر حکمرانی کی۔ دولت عباسیہ کے بعد سلاطین وخلفاء کے خاندانوں کا حال جدا جدا لکھتے ہیں +

فصل دوم سپین

خلفاء بنی امیہ (قرطبہ) چھوٹے خاندان ۵۔ حمودیہ۔ مالقا ۶ حمودیہ (الجیاسی رس)

۷۔ عبادیہ (اشبیلیہ) ۸ زاریہ (غرناطہ) ۹ جواہریہ (قرطبہ)

۱۰۔ ذوالنونیہ (طلیطلہ) تولود و ۱۱۔ عامریہ (بلنشیہ) ۱۲۔ توجیبہ در ہدیہ (زارگوزہ)

۱۳۔ شاہان دینیہ (المرابطین)۔ الموحد (۱۴) نصریہ (غرناطہ)

مسلمانوں نے سپین کو ۹۲ھ - ۷۱۱ء میں فتح کیا تھا اور ۱۳۸ھ - ۷۵۶ء تک اور ملکوں کی طرح اس میں بھی خلفاء بنی امیہ اپنی طرف سے حاکم مقرر کرتے رہے۔ خاندان بنی امیہ کے چند ارکان جو خاندان عباسیہ کے قتل عام سے بھاگ کر بچ رہے تھے انمیں عبد الرحمن بنی امیہ کے دسویں خلیفہ ہشام کا پوتا بھی تھا چند روز تک وہ پریشان پڑا پھرا۔ پھر اُسنے اندلس (سپین) میں دیکھا کہ قوم بربر اور عرب کے قبائل حسد وبغض کے سبب سے آپس میں بادشاہی کے لئے مخالفت کر رہے ہیں اس نے یہ موقع اچھا پا کر اپنے تئیں سپین کا بادشاہ بنا لیا ۱۳۸ھ میں سپین کے بڑے بڑے مسلمانوں نے اس کی اطاعت کر لی اور لشکر عباسیہ نے جو اُسپر حملہ کیا اُسکو شکست اُسنے دیدی۔ اس فتح سے اس کے خاندان میں سپین کی فرماں روائی جم گئی اور اُسکے جانشینوں نے قرطبہ (کوردوا) کو اپنا

دارالسلطنت بنایا اور شمال کے عیسائیوں کو اور بہت سی اپنی رعایا کی دنگہ و فساد و بغاوت و سرکشی کو
دبایا ڈھائی سو برس تک بڑی کروفر سے سلطنت کی۔ اول اول انھوں نے امیر و سلطان کے لقب پر
قناعت کی لیکن عبدالرحمٰن ثالث کے عہد میں ۳۱۷ھ ۹۲۹ء میں خلیفہ کا خطاب اپنا رکھا۔ اس خاندان میں سب سے
بڑا زبردست سلطان عبدالرحمٰن سوم ہوا ہے اسنے فقط اپنی ہی رعایا پر زبردست حکومت نہیں کی
بلکہ عیسائی بادشاہوں کو اسنے روکا اور افریقہ کے حملوں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھا بحر مڈی ٹرینین پر
بحر شام پر اسکی بحری قوت بڑی شان و شوکت کی تھی۔ جہازوں کے بڑے بڑے جنگی بیڑے اس بحر میں اسکے رہتے
تھے اسکی موت کے بعد خلیفہ بنی امیہ نے کوئی بڑا کام نہیں کیا مگر اسکے وزیر المنصور نے سلطنت میں اتحاد رکھا
پانچویں صدی میں سپین میں مسلمانوں کے جھگڑے ایسے شروع ہوگئے کہ طوائف الملوکی ہوگئی چھوٹی چھوٹی
ریاستیں خود مختار ہوگئیں۔ سپین میں خاندان بنی امیہ نے ۱۳۹-۴۲۲ھ ۷۵۶-۱۰۳۱ء تک سلطنت کی قرطبہ انکا دارالسلطنت
تھا۔ پھر طوائف الملوکی میں خاندان حمودیہ نے مالقہ ۴۳۱-۴۵۶ھ ۱۰۲۹-۱۰۵۸ء الجی سی رس میں سلطنت کی خاندان عبادیہ نے اشبیلیہ
(سی ول لی) میں ۴۱۴-۴۸۴ھ ۱۰۲۳-۱۰۹۱ء تک سلطنت کی اور خاندان زہریہ نے قرطبہ میں ۴۰۳-۴۸۳ھ ۱۰۱۱-۱۰۹۰ء تک فرمانروائی
کی اور غرناطہ میں ۴۲۲-۴۶۱ھ ۱۰۳۱-۱۰۶۸ء تک خاندان جوہریہ نے بادشاہی کی تولیدو میں ۴۷۸ھ تک خاندان
ذوالنونیہ نے سلطنت کی بلنیشیہ (ویلن شیا) میں ۴۱۳-۴۷۸ھ ۱۰۲۱-۱۰۸۵ء تک خاندان عبادیہ نے حکومت کی ۴۷۹ھ ۱۰۸۶ء
میں خاندان عبادیہ نے ایک دفعہ الفنسو لیون سے لڑنے کے لئے خاندان المرابطین کو بلایا تھا۔ دوبارہ
۴۸۳ھ ۱۰۹۰ء میں انکو پھر بلایا تو انہوں نے سپین کا ملک جتنا مسلمانوں کے پاس تھا اسے فتح کرلیا اور
اپنی افریقہ کی سلطنت کا ایک صوبہ اسکو بنا لیا۔ اور اس خاندان کا قائم مقام خاندان الموحد ہوا انہوں
نے سپین کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ ہی قرار دیا۔ ان دو حملوں اور خاندان الموحد کے درمیان
بلنیشیہ (وے لی نی شیا) اور مورشیا کی ریاستوں اور خاندانوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔
عیسائیوں سے بہت لڑائیوں کے بعد شہر غرناطہ سے مسلمانوں کو فرڈی نند اور ایزبی بلا کے حملوں
نے نکال دیا اور ۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

فصل سوم شمالی افریقہ

۱۵ ادریسیہ (مراکش) ۱۶ اغلبیہ (تیونس) خاندان بنی فاطمہ (مصر کو دیکھو) زیریہ (ٹیونس)

۱۸ حمادیہ (الجیریا) ۱۹ المرابطہ (مراکش۔ الجیریا۔ سپین) ۲۰ الموحد (شمالی افریقہ سپین)
۲۱ زیانیہ (مراکش) ۲۲ زیانیہ (الجیریا) ۲۳ حفصیہ (ٹیونس) ۲۴ شریفیہ (مراکش)

افریقہ کے صحرائے عظیم اور بحر مڈی ٹرینین کے درمیان ایک حصہ زمین قابل آبادی ہے وہ ہمیشہ سے سام کی اولاد کی دایہ رہا ہے۔ یہودیوں کے ہاں جس پیغمبر کی بے قدری اپنے وطن میں ہوئی وہ یہاں ضرور آتا۔ اور یہاں کے لوگ اُس کو سر پر بٹھاتے۔ اور اُس پر ایمان دل و جان سے لاتے یہاں کے باشندوں کی سرشت میں پیغمبروں کا معتقد ہو جانا داخل تھا۔ خاندان عباسیہ کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ ایسے دور دست ملک میں جس کے باشندے جنگ جو و تند خو ہوں اپنی خلافت کو قائم رکھتے اور اُسکی رعایا کی بغاوت کے دبانے کے لئے لشکر عظیم رکھتے اور طرح طرح محنت و مشقت اُٹھاتے اور زر کثیر خرچ کرتے۔ علاوہ المرابطہ اور الموحد خاندانوں نے خاندان علویہ کی سلطنت جمائی جیسے خاندان ادریسیہ اور خاندان فاطمیہ نے رونق پائی۔ شمالی افریقہ کو اہل عرب نے بڑی مشکل سے ۴۶-۷۹ھ ۶۶۶-۶۹۸ء میں فتح کیا تھا۔ خلفاء عرب جو اپنے نائب یہاں مقرر کرتے تھے۔ اُنکی کامیابی و کارروائی میں یہاں کی رعایا کبھی کبھی خلل ڈالتی تھی جب تک یزید بن حاتم جو ہر دل عزیز تھا اور جو ایک مرد تھا قیروان میں خلفاء عباسیہ کی طرف سے فرماں روا رہا۔ بربر کی رعایا کو سرکشی کا حوصلہ نہ ہوا لیکن جب اُس نے ۱۷۰ھ ۷۸۷ء میں وفات پائی تو شمالی افریقہ میں بدنظمی پھیل گئی اور طوائف الملوکی ہو گئی اور خود وہیں کے رہنے والوں میں ایسے خاندان پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کر لی ۳۰۰ھ میں حد مصر کی مغرب میں خاندان عباسیہ کی حکومت کسی طرح کی باقی نہیں رہی۔

۱۵ خاندان سادات ادریسیہ (مراکش) ۱۷۲-۳۷۵ ۷۸۸-۹۸۵

۱۶۹ھ ۷۸۵ء میں مدینہ میں حضرت علی کے خاندان اور دیگر مسلمانوں میں ہنگامہ عظیم برپا ہوا۔ اس ہنگامہ میں ادریس بن عبداللہ بن حسن بن حسن

بن علی بن ابو طالب بھی شریک تھا - جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو ادریس مصر میں بھاگ گیا - اور مراکش کو چلا گیا اور یہاں خاندان علویہ کی سلطنت کی ضلع سبتہ کے قریب بنیاد قائم کی اس کے سکوں میں تدغا اور ولیلہ کے شہروں کے نام ہیں - یہ سلطنت اپنی غایت وسعت پر ۲۴۵ھ / ۸۶۰ء میں پہونچی اور بہ تدریج اسکا تنزل ہوا اور ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا -

۱۸۴ - ۲۹۶ - ۱۶ خاندان اغلبیہ (ٹیونس) ۸۰۰ - ۹۰۹

خلیفہ ہارون رشید نے کل اضلاع افریقہ میں یزید کو حاکم اعلیٰ مقرر کیا تھا جو ٹیونس میں رہتا تھا اسے خاندان ادریسیہ کو جو مغرب میں فاصلہ بعید پر حکمرانی کرتا تھا کچھ ستایا نہیں ابراہیم بن اغلب صوبہ زاب میں حاکم تھا اسکا خاندان بالکل آزاد تھا - اغلبیہ خاندان نے بہت ہی کم خلفاء کا نام اپنے سکوں میں اور خطبوں میں درج کیا اور نہ انکی دینی و روحانی بزرگی کو تسلیم کیا صرف خشکی ہی میں وہ نہایت مہذب شائستہ و جید حاکم نہ تھے بلکہ وہ بحری طاقت بھی بڑی رکھتے تھے - مدتوں تک بحر روم بحر شام میں انکے بڑے بڑے بیڑے جہازوں کے اٹلی - فرانس کو سیکا - سارڈی نیا کو ساحل بحر کو تاخت و تاراج کرتے تھے - انھوں نے جزیرہ سسلی کو ۲۱۲ - ۲۳۴ھ / ۸۲۷ - ۸۷۸ء میں فتح کر لیا - وہ جب تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا کہ نورمن نے اسے فتح کیا جب تک افریقہ میں خاندان اغلبیہ کی حکومت رہی اہل عرب کی بحری قوت نہایت زبردست بحر وسطی تو بینین میں رہی سمندروں میں اور قومیں انکے جہازوں کے ناموں سے کانپتی تھیں سوا جزیرہ سسلی کے انھوں نے مالٹا اور سارڈی نیا کو بھی فتح کر لیا اور روم کی حدود پر بھی حملہ کیا - مگر آخر زمانہ میں اس خاندان میں سلاطین نالائق ہونے لگے اور مغرب میں ادریسیہ شیعوں کے غلبہ نے بھی مسلمانوں کے فرقوں میں فساد کھڑے کئے اسلئے ۲۹۶ھ / ۹۰۹ء میں خاندان بنی فاطمہ کے فتح کے لئے دروازہ کھل گیا - خاندان اغلبیہ کا جانشین خاندان بنی فاطمہ ہوا - اس خاندان کا تعلق زیادہ تر مصر کے خاندان سے ہے - ایک زمانہ میں انکی سلطنت میں کل شمالی افریقہ کا کنارہ مصر سے لے کر بحر اطلانٹک تک داخل تھا اور جزیرہ سسلی اور سارڈی نیا بھی اس میں شامل تھا مگر جب ۳۶۲ھ / ۹۷۲ء میں انکا دار السلطنت قاہرہ میں منتقل ہوا تو بہت سی ریاستوں نے یہاں سلطنت کا دباؤ اٹھ گیا اور مغربی اضلاع میں اسکی

حکومت کا زور بہت ضعیف ہوگیا۔ افریقیہ میں جو نائب سلطان یوسف بلکین تھا اور صنہاج و
بربر میں جو حاکم تھے ان سب نے اپنے تئیں خود مختار بنا لیا اور خاندان زیریہ اور خاندان حمادیہ نے
اپنے خاندانوں کی سلطنت کو قائم کر لیا۔ خاندان حمادیہ تو الجیریا میں بوجایا میں حکومت کرتا تھا
اور خاندان زیریہ کی حکومت ضلع ٹیونس سے کچھ آگے تھی مغرب میں فاصلہ دراز پر مراکش
میں مختلف قومیں بربر مک نسا وغیرہ آزاد ہوگئیں اور ادریسیہ سلطنت کے قائم مقام بن گئیں مگر ان
خاندانوں کو سلاطین کا درجہ نہیں حاصل ہوا اُن کو خاندان المرابط نے محکوم کر لیا اور الجیریا کا
خاندان حمادیہ کی مملکت کا حصہ اُنہوں نے دبا لیا۔ مگر حماد و زیری کی دار السلطنت تونس حکمرانی الموحد
ے کی قسمت میں لکھی تھی +

۳۶۲ - ۵۴۳	۱۷ خاندان زیریہ	(ٹیونس)	۹۷۳ - ۱۱۴۸
۳۹۸ - ۵۴۷	۱۸ خاندان حمادیہ	(الجیریا)	۱۰۰۷ - ۱۱۵۲
۴۴۸ - ۵۴۱	۱۹ دولت المرابطین	یا ملثمین	۱۰۵۶ - ۱۱۴۷

قبائل حمیر میں سے ملثمین بھی ہیں جو یمن سے حضرت ابوبکرؓ پاس وہ آئے تھے شام و مصر کی
طرف بھیجے گئے۔ پھر مغرب کی طرف موسیٰ بن نصیر کے ہمراہ گئے اور بعد ازاں طارق کے ساتھ طنجہ
تک پہونچے انکو تنہائی اور آزادی پسند تھی اسلئے انھوں بربر کی سکونت اختیار کر لی سنہ ۴۴۴ میں
ان میں سے ایک شخص جو سر قبیلہ جدالہ کا قیروان سے اپنے ساتھ فقیہ عبداللہ بن یاسین کو اس ارادہ
سے لایا کہ یہاں دین اسلام کی وہ تعلیم کرے چنانچہ یہ فقیہ قبیلہ لمتونہ میں آیا اور شریعت اسلام
کی پابندی کی تاکید کی تو انھوں نے کہا کہ بھائی سُنتو نماز۔ روزہ۔ زکوۃ تو قریب العقل ہیں انکو
بیشک مان لینگے مگر یہ جو تم کہتے ہو کہ جو کوئی کسی کو مار ڈالے وہ مارا جائے اور جو چوری کرے
اُسکے ہاتھ کاٹے جائیں اور جو کوئی زنا کرے وہ رجم کیا جائے یہ باتیں ہم سے نہیں ہو سکینگی
تم ہو تو ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔ جوہر و عبداللہ بن یاسین اور قبائل پاس گئے جنمیں سے
اکثر نے شریعت اسلام کی پیروی کو مان لیا اور بعض نے انکار کیا۔ پھر عبداللہ نے ان قبائل کو
جہاد کے لیئے کہا اُنھوں نے کہا کہ آپ ہمارے امیر المسلمین بنئے مگر عبداللہ نے نہیں مانا

اور منجوہر نے اُسے قبول کیا۔ مگر ان دونو نے ملکر ابوبکر بن عمر کو امیر المسلمین بنایا۔ اُس کے پاس بہت سے قبائل جمع ہو گئے اُسنے اُنکو خطاب المرابطین کا دیا جسکے معنی ایسے سپاہیوں کے ہیں جو دشمنوں کی سرحد میں گھوڑے چلائیں یا باندھیں۔ ان مرابطین کا لقب ملثمین بھی ہے اسواسطے کہ انھوں نے حکومت مستقل کے بعد اپنی عورتوں کے لئے دہان بند بنائے تھے کہ انکی تمیز اور غیر قوموں سے رہے۔ اور وہ ان عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کے اور دہانہ بند لگا کے میدان جنگ میں لے گئے تھے جس سے دشمنوں نے دھوکا کھایا کہ ان عورتوں کو دشمن سپاہی سمجھے اور لشکر کی تعداد کو ان دہان بند عورتوں کے سبب سے زیادہ تخمینہ کیا اسلئے مرابطین فتحیاب ہوئے اور انھوں نے یہ خیال کرکے کہ ہم کو لثام یعنی دہان بند کی برکت سے یہ فتح نصیب ہوئی ہے اپنا لقب ملثمین رکھا +

چھٹی صدی کے وسط میں سپین میں عیسائیوں نے فتوح حاصل کیں۔ اور اہل جنیوا اور پی سان نے مسلمانوں سے کورسیکا اور سارڈینیا چھین لیا جنوبی اٹلی میں نورمن نے اپنی بہادری اور دلیری دکھائی اس سبب سے بحر مڈی ٹرینین میں مسلمانوں کی قوت ضعیف ہو گئی۔ فقط مصر میں دولت بنی فاطمہ شان اسلام کو دکھا رہی تھی۔ ٹیونس میں خاندان زیریہ میں یہ قوت نہیں تھی کہ وہ ان بغاوتوں کو جو انکی محدود سلطنت میں ہوتی تھیں اُنکو بھی دبا سکیں۔ زیریہ۔ حمادیہ۔ فاطمیہ۔ خاندانوں میں باہم رقابت و عداوت ایسی تھی کہ وہ سب ملکر اپنی قوت متفقہ کو ان عیسائیوں کے مقابل میں کام میں نہیں لاسکتے تھے۔ مگر قوم بربر میں فقیہ عبد اللہ نے اسلامیہ قوت و حمیت اور غیرت کو پھر زندہ کر دیا۔ اسنے اسلام کی شان و شکوہ کے لئے قبائل بربر کو جہاد پر آمادہ کیا اور المرابطین انکا نام رکھا۔ اسکے علم کے نیچے لمتونہ بربر کے ساتھ قبائل عظیم مسوداً جمع ہو گئے جس سے اُس کے پاس جمعیت کثیر ہو گئی۔ اور ابوبکر اور عبد اللہ بن یاسین امیر المسلمین ہو گئے اور پھر وہ اہل سوس سے لڑے۔ اور پھر مرابطین نے سجلماسہ و اغمات فتح کر لیا۔ اور ابوبکر یہاں کا بادشاہ ہوا تو اُسنے اپنے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین لمتونی کو یہاں حاکم مقرر کیا۔ یہ یوسف بن تاشفین بڑا پکا دیندار تھا عقیل و ذہین جری بہادر بڑی بلا کا تھا۔ ۴۵۳ھ میں ابوبکر کے مرنے کے بعد یہاں کا بادشاہ وہی ہو گیا اور اسکا لقب امیر المسلمین رکھا گیا۔ وہ مغرب کی طرف گیا اور چند قلعے اُس نے